

فصل ہشتم

(۱)

اسکاٹی لارکوں کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔

شہر کی پس ماندہ بستیوں میں تعلیم بالغاں کے پانچ مرکز قائم تھے۔ دو دارالمطالعہ ڈپنری صرف ایک تھی۔ مگر صبح سے شام تک اس پر مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ کئی کئی میل مریض آتے۔ ڈاکٹر زیدی کو سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی۔ اکثر راتوں کو لوگ گہری نیند سے کر کے اسے اپنے ہمراہ لے جاتے۔ مگر اس کی پیشانی پر کبھی شکن تک نہ آئی۔ وہ آنکھیں ملاتا اور کبھی کبھی تو کپڑے تبدیل کئے بغیر مریض کو دیکھنے چلا جاتا۔ اس حلقے میں وہ ڈاکٹر کے بجائے میلیا لگتا۔ اسے ڈاکٹر تسلیم کرنے میں اکثر مریضوں کو مشکل سے یقین آتا۔

ان اداروں کے علاوہ فلک پیا نے دستکاری اور گھریلو صنعت کو فروغ دینے کے لیے انڈسٹریل ہوم بھی کھولا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک میں مرد دست کار اور کارگر کام کرے اور دوسرا خواتین کے لیے تھا۔ اس میں بیوہ اور لاوارث عورتوں کو تربیت بھی دی جاتی اور لا گھریلو مصنوعات بھی تیار کرائی جاتیں۔

انڈسٹریل ہوم کا بنا ہوا مال بازار میں فروخت کیا جاتا فلک پیا کا پروگرام تھا کہ شہر بازار میں انڈسٹریل ہوم کی جانب سے ایک شوروم کھول دیا جائے جہاں مصنوعات کی نمائش اور ان کو فروخت بھی کیا جائے۔ اس طرح دکان داروں کو جو کمیشن دیا جاتا تھا وہ بچ جائے۔

سرگرمیاں: مصروفیات، کام کاج، دارالمطالعہ، لاہریری، کان میلیا، کان صاف کرنے والا، دست کار، ہنرمند، شوروم، مردوں

اپنی عملی جامہ نہ پہن سکی۔

ہوا یہ کہ ایک روز کوئی دو بجے شب کو ایک شخص ڈاکٹر زیدی کے پاس آیا۔ ڈاکٹر آدھ گھنٹہ باہر کسی مریض کو دیکھ کر آیا تھا اور تھکا ہارا بے خبر سو رہا تھا۔ اسے مجبوراً اٹھنا پڑا۔ آنکھیں ملتا ہوا ہنری میں گیا۔ ایمر جنسی دواؤں کا بیگ اٹھایا اور اس شخص کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کا چہرہ ڈھلتی کے چاند کی طرح زرد تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا اور جلدی جلدی بول رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ڈاکٹر نے اندازہ لگایا کہ کسی عورت کا کیس ہے۔ مریضہ اس کی بیوی تھی اور اس کی حالت بہت بری تھی۔

ڈاکٹر زیدی نے جا کر دیکھا۔ مریضہ ایک سیلے ہوئے تنگ و تاریک کمرے میں بوسیدہ چٹائی پر سہمہ پڑی تھی۔ کمرے میں چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی میں وہ لاش کی مانند بے جان نظر آرہی تھی۔ اس کے بال دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ منہ سے سفید سفید جھاگ نکل رہی تھی۔

ڈاکٹر نے مشتبہ نظروں سے مریضہ کو دیکھا۔ اس نے کوئی زہریلی چیز کھا کر خود کشی کی کوشش کی۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا۔ اس نے مریضہ کا معائنہ کیا تو اس کا خیال درست نکلا۔ اس نے مریضہ کے شوہر سے پوچھا۔

”تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟“

”جھگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔“ اس شخص کی بات میں ذرا بھی جھجک اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

ڈاکٹر نے ذرا دیر خاموش رہ کر کہا۔ ”پھر اس نے زہر کھانے کی کیوں کوشش کی؟“ اس کا زرد چہرہ حیرت اور خوف کے طے جلے تاثر سے سیاہ پڑ گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ابھٹ میں جلدی جلدی گردش دے کر کہا۔ ”زہر؟“ لمحہ بھر کے لیے اس نے کچھ سوچا۔ ”نہیں“ (صاحب ایہ زہر تو کھا ہی نہیں سکتی۔) یہ بات اس نے بڑے اعتماد سے کہی تھی۔

”تو پھر آج اس نے کیا کھایا ہے؟“ ڈاکٹر کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ جھجکنے لگا۔ اس کی ہچکچاہٹ سے زیدی کو ایک بار پھر شبہ

پھر یہاں: عمل میں لانا ہے سہمہ ہے ہوش۔

ہوا کہ یہ ضرور خود کشی کا کیس ہے۔ اسے ضرور اس کا علم ہے اور چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔
نے کسی قدر تھکے لہجے میں کہا۔

”بتاتے کیوں نہیں اس نے کیا کھایا ہے؟“

اس شخص کا چہرہ مردے کی طرح خاکستر نظر آنے لگا۔ وہ ڈاکٹر سے نظریں نہ ملا سکا۔ طبعاً
کی طرح گردن جھکا کر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور حلق سے اس طرح بھا
رہی تھی جیسے سسکیاں بھر رہا ہو۔ اس نے جوابات بتائی اسے سن کر ڈاکٹر زیدی لرز کر رہ گیا۔
وہ شخص چار مہینے سے بے روزگار تھا۔ پہلے کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ عام تحفہ
چھانٹی کے زمانے میں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اب تک نہ تو اسے ملازمت ملی تھی اور نہ
سرمایہ تھا جس سے وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیتا۔ پرسوں صبح سے دونوں میاں بیوی سڑ
فاقہ کشی کر رہے تھے۔ مگر سب سے زیادہ پریشانی شیر خوار بچے کی جانب سے تھی جس نے دودھ
لیے ماں کی چھاتیوں کو نوج نوج کر زخمی کر دیا تھا۔ آج شام وہ قرض ادھار کا بندوبست کرنے گیا
واپس آکر دیکھا۔ بیوی بار بار قے کر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ جب بچے نے بہ
زیادہ پریشان کیا اور اس کا بلکنا اس سے دیکھا نہ گیا تو وہ کوڑا ڈالنے والے ڈرم میں سے کھانے کی اٹا
ڈھونڈ کر لائی تھی اور ان کو کھایا بھی تھا۔ اس کے بعد اس کی یہ حالت ہو گئی۔

ڈاکٹر زیدی نے اس شخص کو دیکھا جو ملازموں کی طرح گردن جھکائے شرمسار کھڑا تھا۔
چہرہ سانپ کے پیٹ کی طرح مٹایا نظر آرہا تھا۔ دیوار کے قریب اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی
اس کے سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر گندے کپڑے مٹا
ہوا ایک بچہ لاش کی مانند پڑا تھا۔ طاق میں رکھا ہوا چراغ بار بار بھڑکتا۔ روشنی سے آنکھ بھولی کر
کبھی اندھیرا کبھی اجالا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ اچانک خوفناک چیخیں بلند ہونے والی ہیں۔

ڈاکٹر نے مریضہ کو دوا دی۔ اس کی جیب میں اس وقت پانچ روپے تھے، وہ بھی اسے
دیئے اور واپس ہیڈ کو ارٹر آگیا۔ بستر پر لیٹا دیر تک مریضہ اور اس کے شوہر کے متعلق غور کر رہا
مہینے کے آخر میں جب اس نے فلک پیا کے اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کی تو اس واقعے کا نام
پر ذکر کیا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر زیدی نے یہ تجویز پیش کی کہ چھوٹے پیمانے پر ایک امدادی بینک قائم کیا جائے جس سے آسان قسطوں اور منافع کی بہت معمولی شرح پر ضرورت مندوں کو قرضے دیئے جائیں تاکہ وہ کوئی کاروبار شروع کر سکیں۔ اس تجویز کو اسکائی لارکوں نے پسند کیا اور یہ طے کیا گیا کہ بینک کی بنیائی جائے جو بینک کے قیام کے لیے منصوبہ تیار کرے۔

بہنے بھر کے اندر ہی اندر کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ صفدر بشیر نے اس مقصد کے لیے اپنی کم از کم ۲۰ ہزار روپیہ دیا۔ امدادی بینک قائم ہو گیا۔

فلک پنا کا کام جس قدر وسیع ہوتا جا رہا تھا اسکائی لارکوں کی مصروفیت بھی اسی قدر بڑھتی رہی تھی۔ ہر اسکائی لارک کو کئی کئی شعبوں میں کام کرنا پڑتا۔ چنانچہ مجلس عاملہ کے سامنے یہ تجویز برحمت آئی کہ اسکائی لارکوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ بہت سے نوجوان اس کے لیے آمادہ نہ رہا شعور اور تعلیم یافتہ بھی تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اسکائی لارکوں کی تعداد بڑھا کر پندرہ کر لیا جائے۔ اس سے زیادہ تعداد بڑھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ صفدر بشیر اب تک پچاس ہزار روپے دینا کے فنڈ کے لیے دے چکا تھا۔ تنظیم اس پر زیادہ بار ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ چندے کے بوجھ مہیا کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا مگر اس کے لیے ہنوز کسی مہم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ فلک اپنے منصوبوں کے لیے روپے کی ضرورت تھی جو روز بروز شدید ہوتی جا رہی تھی۔



فلک پنا کی مجلس عاملہ سنجیدگی سے فنڈ کے مسئلے پر غور کر رہی تھی کہ ایک رات خان بہادر آنے کی اطلاع ملی۔

اسکائی لارکوں کو اس کی آمد پر سخت حیرت ہوئی۔ صفدر بشیر اور علی احمد نے لاہریری میں منہاڑ سے ملاقات کی۔

یہ ملاقات ایک خوشگوار رات تھی۔ اس وقت نونج چکے تھے۔ خان بہادر ہلکے پھلکے لباس میں حسب معمول اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ لڑائی جھگڑنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے اس کے انداز میں تصنع پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہمراہی سکرٹس لایا تھا جو بازار میں نایاب تھیں۔ اس نے دونوں اسکائی لارکوں کو اصرار کیا کہ ان سکرٹس پلائی اور لائٹر نکال کر ان کو سلگایا بھی۔ یہ لائٹر خالص سونے کا بنا ہوا تھا اور اس پر

ایک قیمتی پکھراج جڑا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں پکھراج جھللاتا تو کمرے میں ستارے جگمگانے لگے۔
خان بہادر نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی لائٹ سے کیا۔

مگر علی احمد کو ان باتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ خان بہادر کے آنے سے پیشتر وہ اپنا سر گرمیوں کی ہفتہ وار رپورٹ تیار کر رہا تھا اور یہ سوچ کر آیا تھا کہ خان بہادر سے جلد ہی یہ حاصل کر لے گا صفر بشیر کچھ اور بھی زیادہ اس کی باتوں سے اکتایا ہوا تھا۔ آخر اس نے خان بہادر سے بات کاٹ کر کہا۔

”معاف کیجئے خان بہادر صاحب! ٹھیک ساڑھے نو بجے ہماری ایک مینگ ہے۔“

خان بہادر جہاں دیدہ اور صحبت یافتہ آدمی تھا۔ اس نے ایک ہی جملہ سے اندازہ لگا لیا کہ وہ زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ وہ بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔

”بھی میں کفارہ ادا کرنے آیا تھا۔“

صفر بشیر نے حیرت سے پوچھا۔ ”یعنی؟“

خان بہادر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنا بریف کیس کھولا۔ بک نکالی اور پچیس ہزار کا چیک کاٹ کر صفر بشیر کے سامنے ڈال دیا۔ دونوں اس کائی لارک فور۔ چیک دیکھنے لگے۔ خان بہادر مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

”یہ آپ کی امانت ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ آج میں نے سوچا ہے۔“

پہنچا دوں۔“

علی احمد نے سوچا کہ خان بہادر اس وقت ضرور کوئی نیا چکر چلانے آیا ہے۔ اس نے نظروں سے خان بہادر کو دیکھا جو بلاوجہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے انداز سے خوشامد صاف جھک رہی تھی۔ علی احمد نے دریافت کیا۔

”اس کے ساتھ جو شرائط ہوں وہ بھی لگے ہاتھ بتا دیجئے تاکہ ہم جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔“

خان بہادر قہقہہ مار کر بے تکلفی سے بولا۔ ”بھی آپ لوگ تو میری طرف سے بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے مسجد کا مسئلہ خالص دینی تھا اور ایک سچے مومن کی حیثیت سے میرا اپنا

پکھراج: ایک قیمتی جڑ۔ جہاں دیدہ: تجربہ کار۔ صحبت یافتہ: محفلوں میں چلنے والا۔ کفارہ: کتباً غلطی کا بدلہ۔ لگے ہاتھ: سناٹا۔

”علی احمد نے اسے آگے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔

”بہتر ہو گا کہ اس وقت ہم اس مسئلے پر بات نہ کریں۔“

خان بہادر کھیانا ہو کر ہنسنے لگا۔ ”چلئے اس کے متعلق گفتگو نہیں ہوگی۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ آپ لوگ میرے متعلق کسی بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں۔“ وہ اپنی پوزیشن صاف کرنے پر تلا تھا۔ گردنوں اسکا کی لارک اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے اور اس قصبے پر اس وقت قطعی بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس دفعہ صفدر بشیر بیچ میں بول پڑا۔ ”اس بات کو تو فی الحال آپ چھوڑ ہی دیں۔“

”بہتر۔ اس کے بارے میں پھر کسی وقت بات کروں گا۔“

علی احمد نے کہا۔ ”آپ نے اپنی شرائط نہیں بتائیں۔“ وہ چاہتا تھا کہ خان بہادر کھل کر بات لے تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ آئندہ کیا کرنے والا ہے اور اس پچیس ہزار روپے کی پیشکش اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

”بھئی میری کوئی شرط و شرط نہیں ہے۔“ خان بہادر نے کہا۔ ”جیسا کہ میں پہلی ملاقات میں ان کی چکاہوں کہ جو آپ کی تنظیم کا پروگرام ہے وہی میں چاہتا ہوں۔ خدا کا خوف ابھی دل میں ہے اس لیے دل میں خدمتِ خلق کا بھی جذبہ ہے۔ تھوڑی بہت جو زندگی رہ گئی ہے چاہتا ہوں کہ اسے تمام کی خدمت میں گزار دوں۔“

علی احمد نے کہا۔ ”بڑا نیک جذبہ ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خندہ تھا۔

خان بہادر نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بس آپ لوگوں کے تھوڑے سے تعاون ضرورت ہے۔“ اس کے لہجے میں عجز تھا۔

صفدر بشیر نے فوراً پوچھا۔ ”کس قسم کا تعاون؟“

”بات یہ ہے کہ آج سے تقریباً تین ماہ بعد یعنی مئی میں میونسپل بورڈ کے انتخابات ہو رہے ہیں اس حلقے سے امیدوار ہوں۔ ویسے میرا اپنا کوئی ایسا ارادہ نہ تھا۔ آپ ہی جیسے بعض کرم خلیا کا سرا ہے کہ میں انتخابات میں ضرور حصہ لوں۔ مجبوراً مجھے آمادہ ہونا پڑا۔“ خان بہادر نے آہستہ بول رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ ”سارا پروگرام بن چکا ہے۔ مگر آپ کے

بہتر انداز پر خطہ: (زیر خندہ) وہ مئی جو نصیبی طور پر ہو۔

تعاون کے بغیر یہ پروگرام ادھورا ہے۔“

صفر بشیر نے مسکرا کر کہا۔ ”ہمارے تعاون کے بغیر بھی آپ ایکشن لڑ سکتے ہیں۔“

”آپ لوگوں کا تعاون ضروری ہے۔ آپ کی تنظیم نے اس علاقے کے لوگوں کی بھڑکی

لیے جو کچھ کیا ہے اور جس قدر آپ لوگوں کی یہاں عزت ہے اسے کون نہیں جانتا۔ بلکہ اگر بات کو آپ خوشامد نہ تصور کریں تو میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ گٹھی کے رہنے والے تو آپ کی پرستش کی حد تک عزت کرتے ہیں۔ اور وہ بے جا بھی نہیں۔ آپ کے کارنامے اسی جذبہ مستحق ہیں۔“

علی احمد نے کہا۔ ”دیکھئے خان بہادر صاحب! فلک پیا کافی الحال کوئی سیاسی پروگرام نہیں

اس لیے اگر آپ ہم کو ان کانٹوں میں نہ گھسیٹیں تو بہتر ہے۔“

”میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی ہمدردی مجھے مل جائے۔ یہی بہت ہے۔“

بہادر نے چیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال آپ میرا یہ نذرانہ قبول کر لیں۔ آ بھی جو کچھ ہو سکا خدمت کرتا رہوں گا۔“

علی احمد نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔ ”یہ تو آپ ایک طرح کی فلک پیا کو رشوت دے

ہیں۔“

”نہیں صاحب! یہ رشوت کیسے ہو سکتی ہے؟“

صفر بشیر نے کہا۔ ”چلے رشوت نہ سہی۔ فلک پیا کے تعاون کی قیمت تو بہر حال آپ

رہے ہیں۔“

علی احمد نے صفر بشیر کی تائید کی۔ ”اور اگر یہ تعاون کی قیمت ہی ہے تو معاف کیجئے خان

صاحب! آپ نے بہت کم قیمت لگائی۔ میں اس پر احتجاج کروں گا۔“

خان بہادر دونوں کی باتوں سے سخت چکر لیا۔ گھبرا کر بولا۔ ”آپ لوگ مجھے غلط سمجھا

ہیں۔ میں تو پورے خلوص کے ساتھ آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

دونوں اس کے خلوص کو ایک بار آزما چکے تھے۔ وہ تجربہ ان کے لیے کافی تھا۔ لہذا ان کو

بہادر کی باتوں پر ذرا بھی اعتبار نہ آیا۔ علی احمد نے کہا۔

”دیکھئے خان بہادر صاحب! آپ کا رویہ آدمی ہیں۔ اس بات سے تو آپ انکار نہیں کرتے

کوشش بھی کریں تب بھی آپ کسی مسئلہ کو کاروباری انداز سے دیکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔“
 صغدر بشیر نے کہا۔ ”اور آپ تو بڑے مجھے ہوئے بزنس مین ہیں۔ یہ صلاحیت خدا کسی کو کم ہی
 ملے۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک کامیاب تاجر بننا چاہوں تو کبھی نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے
 بلخصوص سپرائٹ کی ضرورت ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔“ وہ بڑی روانی
 سے بول رہا تھا۔

خان بہادر بہت شیشیا۔ مگر وہ اتنی جلد ہتھیار ڈالنے والا اسامی نہیں تھا۔ اس نے صفائی پیش
 کرنے کی کوشش کی۔ ”اگر آپ حضرات نے تعاون کیا اور خدا کا فضل شامل رہا تو میں میونسپلٹی کا ممبر
 بن ہو جاؤں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ میں عوام کی کس خلوص اور نیک نیتی سے خدمت کرتا ہوں۔“
 ”آپ کے خلوص کا تو ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔“ صغدر بشیر نے طنز کیا۔

علی احمد نے بھی معاف نہ کیا۔ فوراً ہی وار کیا۔ ”اور آپ کی نیت پر کون کافر شبہ کر سکتا ہے۔
 آپ کے ایسے مرد مومن کی نیت پر تو شبہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

خان بہادر پر انا گھاگ تھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ بات بننے کے بجائے بگڑتی جا رہی ہے۔ اس نے
 ہٹ ہٹ کر بدلا۔ چہرہ بادقار بنا کر بولا۔

”دیکھیے یہ بات تو آپ لوگ خود ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی جماعت یا تنظیم کا کوئی سیاسی
 اگراں نہیں ہے۔ آپ انتخابات میں کسی نہ کسی امیدوار کی مدد تو ضرور ہی کریں گے۔ اگر وہ
 بداد آپ مجھے ہی مان لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری ذات سے آپ کو فائدہ ہی پہنچے گا۔“

علی احمد نے کہا۔ ”یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ فلک پیا کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔
 فلان ہزار کی رقم تو بہت تھوڑی ہے۔ میں اس پر پہلے ہی احتجاج کر چکا ہوں۔“

خان بہادر نے جواب دیا۔ ”پچیس ہزار کی رقم کم نہیں ہوتی۔ اس سے آپ ایک بہتر دفتر تعمیر
 کئے ہیں۔ یہ عمارت تو آپ کی تنظیم کے ہرگز شایان شان نہیں۔ یہاں بجلی تک تو ہے نہیں۔

میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔ بہر حال آپ کی بات کا احترام بھی ضروری ہے۔ چلئے ۳۰ ہزار
 لپٹا کر چیک کاٹے دیتا ہوں۔“

علی احمد بولا۔ ”نہیں خان بہادر صاحب یہ تو بہت کم قیمت لگائی آپ نے۔ کچھ اور بڑھائیے

لکھنؤ لکھاگ: قمر بہ کار۔ حیدر ابدلنا: درخ بدلنا، اندر بدلنا۔ شایان شان: قابل، لائق۔

ہوئی۔“ خان بہادر نے اس کے طنز پر زیادہ توجہ نہ دی اب وہ قطعی کاروباری موڈ میں آگیا۔
 ”جناب ۳۰ ہزار روپے میں آپ دوا چھ خاصے اسکول قائم کر سکتے ہیں جن کو قاعدے سے
 جائے تو پانچ ہزار ہر ماہ آسانی سے کمائے جاسکتے ہیں۔ اس رقم سے سال بھر بعد آپ دوئے
 کھولنے کے قابل ہو جائیں گے۔“

صفدر بشیر نے کہا۔ ”خان بہادر صاحب آپ کے اس قیمتی مشورے کا بہت بہت شکریہ ادا
 پیا کے اس وقت پانچ تعلیمی مرکز قائم ہیں۔ فی الحال مزید مرکز کھولنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ہمارے
 سامنے ان سے بھی زیادہ اہم تجاویز ہیں جن پر فوری طور پر کام شروع کرنے کی ضرورت ہے۔“
 خان بہادر نے رقم اور بڑھادی۔ ”میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۴۰ ہزار تک دے
 ہوں۔ اس روپے سے آپ اپنی اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ بلکہ میرا مشورہ ماننے تو سب
 پہلے آپ کو ایک ڈیری فارم قائم کرنا چاہیے۔ گنئی میں گوالوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ آپ کو
 دوڑدھوپ بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ تجربہ کار آدمی آسانی سے مل جائیں گے۔ اس ڈیری فارم
 ذریعے بہت سے بے روزگاروں کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ آپ بہت بڑی خدمت کریں گے۔
 خسارے کا اس کام میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دودھ اور مکھن کی ضرورت کو تو آپ بخوبی آ
 ہیں۔ اس پروجیکٹ میں اتنا منافع ہے کہ آپ اپنی جماعت کی ملک بھر میں شاخیں قائم کر سکتے ہیں
 یہ کہتے کہتے وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا۔ ”میں نے بہت پہلے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ میرے
 مشوروں سے فائدہ اٹھائیے۔ کہنے کیسی لاجواب اسکیم ہے؟“ اس نے داد طلب نظروں سے دوا
 کو دیکھا۔

علی احمد نے فوراً جواب دیا۔ ”آپ کی سوجھ بوجھ کا تو میں پہلی ہی ملاقات میں قائل ہو گیا
 اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا ذریعہ خیر و نفع عطا کیا ہے۔ ضرورت پڑی تو ان بیش بہا مشوروں کے لیے
 ضرور آپ کو زحمت دیں گے۔ مگر خان بہادر صاحب یہ چالیس ہزار کی رقم بھی کم ہے۔“
 خان بہادر نے ۵ ہزار اور بڑھادے۔ دونوں اسکائی لارکوں نے اس رقم کو بھی قبول کر
 سے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر حیل و حجت کرنے کے بعد خان بہادر ۵۰ ہزار تک پہنچ گیا۔
 ”یہ میرا آخری آفر ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ مگر اس کے لیے یہ بنیادی شرط“

آپ کے تمام ممبرائیکشن میں میرے رضا کاروں کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ان کو اس کام کا اپنی معاونہ نہیں ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ آفر قبول کر لینا چاہیے۔ ۵۰ ہزار کی رقم بہت دینی ہے۔ اگر آپ اسپتال ہی تعمیر کریں تو اس رقم سے ایک شاندار عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔ یہ جو آپ نے اسپتال بناد رکھا ہے، معاف کیجئے یہ تو بالکل کباڑ خانہ معلوم ہوتا ہے کہیں سے بھی تو اسپتال بنی گا۔

علی احمد نے ایک لمحہ بھی اس کی پیش کش پر غور کرنے کے لیے ضائع نہ کیا۔ فوراً بولا۔ ”ہمیں یوں ہے کہ ہم صرف پچاس ہزار کی رقم کے عوض آپ کے ساتھ تعاون نہ کر سکیں گے۔“
خان بہادر کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ”صرف پچاس ہزار!“ وہ سخت بھٹایا ہوا شکل اس کی زبان سے نکلا۔ ”آخر آپ لوگ کتنی رقم چاہتے ہیں؟“

دونوں اسکا لی لار کوں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی چھائی۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ کمرے میں سکوت تھا۔ خان بہادر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ گلے کی رگیں تن گئی تھیں۔ چہرے کی وہ گفتگوئی مٹ گئی تھی۔ اسے وہ ہنس کھ اور بشاش نظر آتا تھا۔ رخساروں کی دبیز کھال لٹکنے لگی تھی وہ بہت بوڑھا لگ رہا تھا۔ توڑی دیر بعد کمرے کی خاموشی میں علی احمد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”کم از کم دو لاکھ تو آپ کو دینا چاہیے۔“
”دو لاکھ!“ خان بہادر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔ جھنجھلا کر کہا۔ ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ لاکھوں روپے کی ممبری کے بجائے سونے کی کان کھودنے جا رہا ہوں۔“

علی احمد اس کی جھنجھلاہٹ سے ذرا مرعوب نہ ہوا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”خان بہادر صاحب! ہمارا تو یہی خیال ہے۔“

”بہت چکر لیا۔ پریشان ہو کر بولا۔ ”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“
منصور بشیر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہمیں تو خان بہادر صاحب یہ سیدھی سادی دینا معلوم ہوتی ہے۔“

خان بہادر نے بلند آواز سے کہا۔ ”بھئی وہ کیسے؟“ ابھی تک وہ حیرت زدہ تھا۔

علی احمد نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اور نہ ہی بہت صاف سی بات ہے۔ دیکھئے نا، جب آپ میونسپل بورڈ کے ممبر بن جائیں گے تو آپ آسٹریلیا اپنے بھتیجے اور بھانجوں کے نام سے ٹھیکے لے سکتے ہیں۔ اگر ہر سال دو تین ٹھیکے بھی مل گئے تو دو لاکھ کمالینا کوئی مشکل نہیں۔ پھر آپ تو پانچ سال ممبری کریں گے۔ بیس پچیس لاکھ بھی آپ ایسے تجربہ کار شخص نے نہ پیدا کئے تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ رشوتوں سے جو رقم ملے وہ علیحدہ رہی۔ کوشش کی جائے تو کمائی کی اور بھی بہت سی صورتیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔“

علی احمد بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔ خان بہادر کا چہرہ سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار ہاٹ ہونٹ چبا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔

علی احمد نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کسی فیکٹری یا کارخانے پر دس بارہ لاکھ روپے لگانے سے تو یہ کہیں اچھا پروجیکٹ ہے کہ میونسپلٹی کی ممبری حاصل کی جائے۔ بلکہ خدا تو فرم دے تو چیز مین بننے کی بھی جوڑ توڑ کرنی چاہیے۔ پھر تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ میں غلام نہیں کہہ رہا؟“

خان بہادر سے ضبط نہ ہو سکا اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”کیا آپ مجھے اتنا خود غرض اور کردار سمجھتے ہیں؟ میں ایک معزز شہری ہوں۔ میں اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔“

علی احمد نے تسلی دیتے ہوئے رسالہ سے کہا۔ ”خان بہادر صاحب! کاروبار میں اس طرح جذباتی ہونے سے کام نہیں چلتا پھر آپ تو ماشاء اللہ بڑے منجھے ہوئے بزنس مین ہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ! بزنس سے میونسپلٹی کے الیکشن کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

صفر بشیر کے لیے اب برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا وہ حقیقت پسند نوجوان تھا۔ کئی سال تک یورپ اور انگلستان میں رہ چکا تھا گفتگو میں بے جا رسمی تکلفات اور چٹان چٹان کا قائل نہ تھا۔ اس نے حیکمے لہجے میں کہا ”تو پھر یہ پچاس ہزار روپے کی رقم آپ فلک پیا کو کیوں پیش کر رہے ہیں؟ کیا آپ اسکاٹی لارکوں کو خمیر فروش اور ایکسپلاٹر سمجھتے ہیں؟ آپ کا ابتدا ہی سے ہمارے ساتھ بیکار رہا ہے۔ مگر ہم نے کبھی آپ کی باتوں پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ اس لیے کہ ہمارے اور آپ کے سوچنے کے انداز میں بنیادی فرق ہے۔ آپ کے نزدیک دولت، زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

حقیقت پسند: سہائی کو پسند کرنے والا۔ بے جا: فضول۔ چٹان چٹان: بے جا۔ خمیر فروش: بے غیرت۔

ہم انسانی محنت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ دولت، تبادلوں جنس کا ایک ذریعہ ہے اور محنت سے انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔ اس نے اس محنت ہی کے ذریعے ہیبت ناک دریاؤں کے رخ بدل دیے۔ مہیب پہاڑوں کا غرور توڑ دیا۔ سمندر کو اپنا مطیع کر لیا اور اب چاند ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔“

صفر بشیر بڑی روانی سے بول رہا تھا بالکل اسی طرح، جس طرح وہ خطیبانہ انداز میں جلسوں سے خطاب کرتا تھا۔

خان بہادر گھبرا کر بولا۔ ”آپ تو نہ معلوم کیسی باتیں کرنے لگے۔ میرا مطلب تو صرف اس قدر ہے۔۔۔۔۔“

صفر بشیر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہم پر بخوبی واضح ہو چکا ہے۔ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے ساتھ اس قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں دو ٹوک بات کہہ دی۔

خان بہادر نے مزید بات چیت نہ کی۔ سگریٹ لائٹر روشن کیا اور پچیس ہزار کا چیک اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔ چیک جلنے لگا۔ بڑا سا شعلہ روشن ہوا کمرے کی دیواریں جھلمائیں۔ چیک جل لگا کسٹریں گیا۔

جھللاتی ہوئی دیواریں دھندلی پڑ گئیں۔

خان بہادر نے اپنا خوبصورت بریف کیس اٹھایا۔ دونوں سے رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ چلا باہر چلا گیا۔

جب اس کی چاپ دور ہو کر معدوم ہو گئی تو صفر بشیر نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور لگا ہوا آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں سستانے کے سے انداز میں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے خان بہادر سے جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی رپورٹ تیار کی اور لاہوریری سے اٹھ لوہنے کے لیے چلے گئے۔



صفر بشیر نے قطع کلام کرتے ہوئے کسی کی بات کاٹ دی۔ دو ٹوک بات کہنا: صاف صاف بات کہنا: سستانا: آرام کرنا۔

علی احمد اور صفدر بشیر کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے فلک پیا کا اجلاس منعقد ہوا۔ رپورٹ پر
دیر تک بحث ہوتی رہی۔

تمام اسکائی لارکوں نے متفقہ طور پر ان دونوں کے اقدام کو سراہا اور خان بہادر کی خدمت
مذمت کی۔ اسی اجلاس میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ فلک پیا کو میونسپلٹی کے انتخاب میں اس خط
سے اپنا امیدوار کھڑا کرنا چاہیے۔ مگر کوئی فیصلہ نہ کیا جاسکا۔ اجلاس دوسرے دن بھی جاری رہا اور یہ
تجویز زیر بحث رہی۔

اسکائی لارکوں کے ایک گروہ کی رائے تھی کہ فلک پیا کو کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہیں لینا
چاہیے۔ جو لوگ الیکشن لڑنے کے حق میں تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر انتخابات میں حصہ نہ
لیا گیا تو خان بہادر یا اسی قبیل کے لوگ میونسپلٹی کے ممبر بنیں گے جو خدمت خلق کی آڑ میں ناجائز
طریقے پر عمل کریں گے۔

دو روز کی طویل بحث کے بعد اسکائی لارک آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ فلک پیا صرف اسی خط
سے الیکشن کے لیے اپنا امیدوار کھڑا کرے۔ اس لیے کہ شہر کے دوسرے حصوں میں ان کے کام کا
رفتار ہنوز ست تھی۔

اس کے علاوہ فنڈ کی کمی تھی۔ کام کرنے والے بھی زیادہ نہیں تھے۔
فلک پیا کے امیدوار کی نامزدگی کے لیے تین اسکائی لارکوں کے نام پیش کئے گئے۔ صفدر بشیر
علی احمد اور ڈاکٹر زیدی۔ لیکن رائے شماری شروع ہونے سے پہلے ہی علی احمد نے اپنا نام واپس لے
لیا۔ وہ الیکشن میں حصہ لینے کے حق میں تھا مگر خود امیدوار بننا نہیں چاہتا تھا۔ دو ٹک ہوئی اور ۶۰
مقابلہ میں ۱۰ کی اکثریت سے ڈاکٹر زیدی کو منتخب کر لیا گیا۔ اسے منتخب کرنے کی سب سے بڑی وجہ
تھی کہ اس حلقے میں وہ بے حد ہردلعزیز تھا۔

نامزدگی کا اعلان ہونے کے بعد اسکائی لارکوں نے دیکھا کہ صفدر بشیر کا چہرہ مر جھا گیا تھا۔
اس وقت کسی قدر بے چین نظر آ رہا تھا۔ بار بار پائپ پر لمبے لمبے کش لگا کر بہت سادھواں فضا
اگل دیتا۔

مگر ڈاکٹر زیدی کی کامیابی پر سب سے پہلے اسی نے مبارک باد پیش کی۔

مذمت کی برائی کی۔ قبیل: حم۔ ہردلعزیز: جس کو سب پسند کریں۔

اسکائی لارکوں نے اپنی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ میونسپلٹی کے انتخابات کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس مہم کا آغاز انہوں نے باقاعدہ منصوبے کے تحت کیا۔ روزانہ کسی نہ کسی چوراہے پر ان کا یہ ہوتا اسکائی لارکوں کی جو شیلی تقریروں نے ہر طرف دھوم مچادی۔ لوگ ان کی باتیں توجہ دلانی سے سنتے اور ان کے جلسوں میں جوق در جوق شامل ہوتے۔

انتخابی مہم کا انچارج علی احمد تھا۔ وہ نت نئے پوسٹر بناتا۔ پمفلٹ لکھتا۔ ہینڈ بل تیار کرتا۔ اسکائی لارکوں کو نئے نئے نعرے دیتا پانچ پانچ منٹ کی چھوٹی چھوٹی تقریریں لکھ کر دیتا۔ یہ تقریریں ٹیٹ کارڈ میٹنگ کے لیے ہوتیں۔ ہوتا یہ کہ اسکائی لارک کسی بھی گلی کے ٹکڑ پر یا سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاتے۔ پہلے وہ اونچی آوازوں سے نعرے لگاتے۔ جب مجمع ہو جاتا تو مختصر سی زیر کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ڈاکٹر زیدی کو انتخابی نشان ”مشعل“ الاٹ ہوا تھا۔ چنانچہ رجمی راتوں میں وہ جتھے بنا کر مشعل بردار جلوس نکالتے۔ مشعلوں کو سروں سے اوپر بلند کر کے لگاتے۔

”ہاتھ میں ہاتھ دو۔“

”روشنی تیز کرو، تیز کرو۔“

”وٹ دیتے وقت مشعل کو یاد رکھئے۔“

”مشعل غریبی اور پس ماندگی کے اندھیرے میں آپ کی رہبر و رہنما ہے۔“

مسلمان کی کوشش سے انتخابی مہم کے لیے تعلیم بالغاں کے مرکزوں سے خاصی بڑی تعداد نالیے رضا کار مل گئے تھے جو جلے جلوسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے نہایت جوش و خروش سے لگاتے۔ مخالف امیدواروں کے کارکن رخنہ اندازی کرتے یا جھگڑا فساد کرنے کی کوشش سے تو اسکائی لارکوں کی حمایت میں وہ سینہ سپر ہو جاتے۔ ڈاکٹر زیدی اور خان بہادر فرزند علی کے لایو نیل بورڈ کے انتخابات میں اس حلقے سے ایک امیدوار اور بھی تھا اس کا نام عبدالحمید تھا۔ وہ

لکھنؤ: گروہ کے گروہ۔ جوش و خروش: گرم جوش۔ رخنہ اندازی کرنا: رکاوٹ ڈالنا۔ سینہ سپر ہونا: ڈٹ جانا۔

چھپچھور اسادھیڑ آدمی تھا۔ نیلام کرنے والوں کی طرح ایک بات کئی کئی بار دہراتا۔ اور بات بات پر قہقہہ لگاتا۔ پچھلے سال تک وہ محکمہ سول سپلائی میں بڑا عہدے دار تھا۔ مگر رشوت خوری کے اسکینڈل میں ملوث ہونے کے باعث ملازمت سے مستعفی ہو گیا تھا۔ سرکاری حلقوں میں ابھی تک اس کا اثر و رسوخ تھا۔ ملازمت چھٹ جانے کا اسے ذرا ملال نہ تھا۔ بینک میں اس کا ۵۵ لاکھ روپیہ موجود تھا شہر میں چار شاندار کوٹھیاں تھیں۔ کئی کارخانوں میں اس کے حصے تھے اور ایک آئل مل کا بھی ڈائریکٹر تھا۔ بڑی شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر خان بہادر کے مقابلے میں اس کا پروپیگنڈا ہلکا تھا۔ خان بہادر اپنی انتخابی مہم پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ اس کے کارکن جھلکتی ہوئی کاروں پر آتے اور ووٹروں کو خریدنے کے لیے نت نئے ریٹ مقرر کرتے۔ جوں جوں انتخابات کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھیں ووٹوں کا ریٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر ہستی پر ٹھیکیدار مقرر کر دیے تھے جن کے ایجنٹ ووٹوں کا سودا کرنے میں مصروف تھے۔

کاغذات نامزدگی منظور ہو چکے تھے اور ہر امیدوار نے انتخابی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ عبد الحمید کی حمایت میں ووٹروں پر سرکاری حکام دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس حلقے کے جو بااثر لوگ ان کو آئے دن تھانوں میں بلایا جاتا اگر وہ عبد الحمید کی مخالفت کرتے تو پولیس کے افسران ان کے خلاف مقدمے قائم کرنے کی دھمکی دیتے۔ غنڈوں کے ذریعے ان کو پریشان کرتے۔ جو لوگ سرکاری ملازم تھے ان کو اپنے محکمے کے افسروں کی جانب سے ہدایتیں دی گئی تھیں کہ عبد الحمید کی طرح سے مدد کریں۔

خان بہادر نے فی ووٹ دس روپے تک کاریٹ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے تین انتخابی دفتر قائم تھے جن میں آئے دن ضیافت ہوتی۔ دیکھیں چڑھتیں۔ بڑی فیاضی سے مرغن کھانے کلاتے جاتے۔ جو لوگ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والے تھے اور سیدھے سادے لوگوں کو چمک دینے کا جانتے تھے، خان بہادر نے انہیں چھانٹ چھانٹ کے اپنے کارکنوں کی حیثیت سے بھرتی کر لیا تھا۔ ان کی یومیہ اجرت مقرر تھی اور ۵ روپے سے ۱۵ روپے تک کاریٹ تھا۔ اس کے علاوہ ووٹروں کو کانٹن کی الاٹمنٹ اور ملازمتیں دلوانے کا لالچ بھی دیا جاتا۔

خان بہادر خود بھی حلقے کا دورہ کرتا۔ اس کی شاندار کار نمودار ہوتی تو اس کے اہلی موالی بھی

سندھی سے لپک کر کار کا دروازہ کھولتے۔ زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ خان بہادر ہونٹوں میں موٹا سا پتھر دبائے، ونشن چرچل بنا بڑے ٹھٹھے سے کار سے نیچے اترتا۔ اس کے آگے پیچھے تنخواہ دار ہر گن ہوتے۔ ان کے جہوم میں گھرا ہوا وہ گلی کو چوں کا چکر لگاتا۔ لوگوں سے ملتے وقت ضرورت سے زیادہ انکساری کا مظاہرہ کرتا۔

اسکاٹی لارکوں کا طریقہ کار بہت سیدھا سادا تھا۔ وہ موٹا جھوٹا لباس پہنتے، ہاتھوں میں تھیلے پتے جن میں پوسٹروں، ہینڈ بلوں اور پمفلٹوں کے علاوہ گڑ اور چنے بھی ہوتے۔ ہر محلے کے لیے کچھ گروپ تھا۔ وہ صبح تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہوتے اور چائے کی ایک ایک گرم پیالی پی کر چاق چوند ہو جاتے۔ سویرے ہی سویرے ہر گروپ کی میٹنگ ہوتی۔ ہر روز کے کام کا پروگرام مرتب کیا جاتا اور سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ ہیڈ کوارٹر سے نکل جاتے۔ وہ میلوں پیدل چلتے۔ عام لوگوں کے ہاتھ فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے۔ ان کے ساتھ حقے پر کش لگاتے۔ بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ ان کا دکھ درد سنتے۔ ان کے جو چھوٹے موٹے کام ہوتے انہیں انجام دینے کی کوشش کرتے۔ بھوک لگتی تو کسی درخت کے سائے تلے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے اپنے تھیلوں سے چنے اور لٹکال کر کھاتے۔ ڈٹ کر پانی پیتے اور تازہ دم ہو کر آگے چل دیتے۔

فلک بیا کی سرگرمیاں طوفان کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کی انتخابی مہم نے ہر طرف ہل مہل مہا کر دی تھی۔ اس کے پاس یوں تو کل ۱۵ کارکن تھے مگر وہ بلا کے کام کرنے والے تھے۔ ایک ایک اسکاٹی لارک کئی کئی محاذوں پر کام کر رہا تھا۔ ہر کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ کہیں بھی گڑ بڑ نہ آئی۔ تعلیم بالغاں کے مرکزوں میں روزانہ کلاسیں ہوتیں۔ انڈسٹریل ہوم میں گھریلو مصنوعات کی کاروبار بڑھ گئی تھی۔ اس کے تیار کئے ہوئے سامان کی بازار میں مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔

اندوای بینک کا کام اطمینان بخش تھا۔ حسابات باقاعدگی سے آڈٹ کئے جاتے۔ بینک کے بس میں کسی قسم کی شکایت اب تک نہیں ملی تھی۔ علاقے کے بہت سے لوگ اس کے قرضوں سے نفع اٹھا رہے تھے۔ بے روزگاری سے نجات پا چکے تھے۔

فلک بیا کی ان بڑھتی ہوئی سرگرمیوں میں سلمان پیش پیش تھا۔ ہر طرف اسی کا چرچا تھا وہ ان

مضمون: تحریک نسواں: غرور، غم، چاق چوبند، ہوشیار، پھسکڑا مار کر: آلتی پالتی مار کر، پاؤں پھیلا کر۔ بلا کے: زبردست۔ محاذ: جگہ۔
 اطمینان سے: اچھے طریقے سے۔ گھریلو مصنوعات: گھر کی بنی ہوئی اشیاء۔

دنوں دیوانہ وار کام کر رہا تھا۔ مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے چند گھنٹے اسے رات کو سونے لیے ملتے۔ ہفتوں شیو تک کرنے کا ہوش نہ رہتا۔ وہ روزانہ سویرے ہی سویرے اپنے گروم میننگ کرتا اور دھوپ نکلنے سے پہلے ہی کام پر نکل جاتا جگہ جگہ تقریریں کرتا۔ پوسٹر لگا کر لوگوں میں ہینڈ بل بانٹتا۔ ان سے تبادلہ خیال کرتا اور رات کو پابندی سے تعلیم بالغاں کے مرکز میں لیتا۔ اس عرصے میں ایک روز بھی وہ غیر حاضر نہیں رہا۔

رات گئے ہیڈ کوارٹر لوفا تو دن بھر کے کام کی پوری رپورٹ پیش کرتا ان دنوں فلک پناہ اجلاس بھی ہوتے۔ سلمان ہر اجلاس میں پابندی سے شریک ہوتا۔ بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لےتا۔ ان مصروفیات کے علاوہ فلک پناہ کی جانب سے اسے یہ بھی ہدایت ملی کہ وہ صفدر بشیر ساتھ مزدوروں کی یونین میں کام کرے۔ یہ ٹریڈ یونین کچھ ہی دنوں پہلے قائم ہوئی تھی اور اس قیام میں فلک پناہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے قیام کی صورت یہ ہوئی کہ مزدور آئے دن اپنی کوئی شکایت لے کر آتے اور اسکائی لار کوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس وقت یہ کی کوئی باقاعدہ یونین نہ تھی۔ ایک آدھ بار ایسی کوشش بھی کی گئی مگر مالکان نے طرح طرح کے کنڈوں سے اسے ختم کر دیا۔ لہذا فلک پناہ کے ایک اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ مزدوروں کی باا یونین بنا کر اسے رجسٹر کرایا جائے۔

اس کے تمام عہدے دار مزدور ہی تھے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے فلک پناہ نے صفدر بشیر مقرر کیا تھا۔ مگر جب یونین کا کام بڑھنے لگا تو سلمان کی ڈیوٹی بھی یونین میں لگادی گئی۔ اس نے میں بھی سلمان پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لے رہا تھا۔



سلمان جس قدر سرگرم اسکائی لارک بنتا جا رہا تھا صفدر بشیر اسی قدر بے حس اور لا پرواہ تھا۔ اس کے انداز میں بے نیازی آگئی تھی۔ اس کی یہ بے نیازی اسکائی لارک اس وقت سے محسوس کر رہے تھے جب سے ڈاکٹر زیدی اس کے مقابلے میں میونسپل بورڈ کے انتخابات کے لیے فلک امیدوار نامزد کیا گیا تھا۔

اب وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ بیشتر وقت لا بھری میں نظر آتا یا اپنے کمرے میں سوتا رہتا۔

ہر ان دونوں بے حد سنجیدہ نظر آتا۔ وہ بات چیت بھی کم کرتا۔ اکثر اپنے سینٹر سے غیر حاضر رہتا جس سے کام میں گڑبڑ پیدا ہوتی اور ہیڈ کوارٹر میں اس کے خلاف شکایات آتیں۔ آخر فلک پیما کے ایک اجلاس میں صفدر بشیر کی بڑھتی ہوئی بے عملی اور غیر ذمہ دارانہ روش کا محاسبہ کیا گیا۔ اس کے خلاف چارج شیٹ پیش کی گئی اور یہ وضاحت طلب کی گئی کہ کیوں نہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی جائے۔

صفدر بشیر، فلک پیما کا نہ صرف صدر تھا بلکہ اس کا بانی اور روح رواں بھی تھا۔ یہی وہ بنیادی باب تھے جن کے پیش نظر جنرل سیکرٹری علی احمد نے دوسرے اسکائی لارکوں کی رائے سے غاف کیا اور یہ مشورہ دیا کہ فی الحال صفدر بشیر کو وارننگ دے دی جائے۔

علی احمد کی تجویز منظور کر لی گئی۔ صفدر بشیر کو وارننگ دی گئی کہ آئندہ وہ اپنے فرائض کی جانب غفلت نہیں برتے گا۔ صفدر بشیر نے کھڑے ہو کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور یقین دلایا کہ وہ ذمہ دار اسکائی لارک کی حیثیت سے اپنے فرائض مستعدی اور دیانت داری سے انجام دے گا۔ اس یقین دہانی کے بعد کچھ عرصے تک صفدر بشیر نہایت سرگرمی سے کام کرتا رہا۔ مگر اس کی بڑی رفتہ رفتہ پھر سر ابھارنے لگی۔ اسکائی لارک اس کے اس رویے کو محسوس کر رہے تھے۔ اکی دور ان میں صفدر بشیر نے ایک ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی جس سے اسکائی لارکوں میں اس خلاف بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔

صفدر بشیر کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کی نوعیت یہ تھی کہ ایک روز اسکائی لارکوں نے گمشدہ ایک بڑے جلسہ عام کا انتظام کیا۔ اس جلسے کے لیے وہ کئی روز سے پہلٹی کر رہے تھے۔ پوسٹر لگائے۔ ہینڈ بل تقسیم کئے گئے۔ اسٹریٹ کارز میٹنگوں کے ذریعے مسلسل اعلان کیا گیا۔ جلسہ کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ لوگ دور دور سے چل کر جلسے میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ لارک اپنی اس کامیابی پر بے حد شاداں تھے۔

طلے کا خاص مقرر صفدر بشیر تھا۔ وہ اپنے خطیبانہ انداز کے باعث علاقے میں بے حد مقبول ہو چکے تھے۔ آکر بولتا تو حاضرین کا تحس تیز ہو جاتا۔ گردن کی رگیں تن جاتیں۔ آنکھوں میں

سرخی دوڑ جاتی اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے۔ اس کی تقریر میں یہ سحر تھا کہ اگر جلسہ گاہ میں کبھی گڑبڑچ جاتی اور وہ مائیک پر آجاتا تو چشم زدن میں جلسہ قابو میں آجاتا۔ اس کی تقریر کی تکنیک یہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی آواز کا حجم بڑھاتا جاتا۔ اسی رفتار سے اس میں روانی پیدا ہوتی جاتی اور جب بے خوب بڑھ جاتا تو اس کی آواز میں گھن گرج پیدا ہو جاتی۔ اس کا لہجہ الہامی معلوم ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر چیز پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ صرف ایک چیز زندہ ہے۔ ایک آواز اور صرف ایک آواز اور وہ آواز صفدر بشیر کی ہوتی۔ حاضرین جذبات سے بے قابو ہو کر نہایت جوشیلے نعرے لگاتے۔ بار تالیاں بجاتے۔ لیکن ایسی جذبات انگیز تقریریں وہ کسی بڑے اجتماع میں کرتا تھا اور اس روز ایسا بڑا اجتماع تھا۔

جلے کا آغاز ڈاکٹر زیدی کی تقریر سے ہوا۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اور بات سمجھا کر کہنے عادی تھا۔ وہ دھیمے لہجے میں سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ جلے میں بددلی سی پائی جاتی تھی۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈانس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہر آنکھ صفدر بشیر کی تلاش میں تھی اور صفدر بڑا اس وقت ایک بار میں بیٹھا اسکاچ سے شغل کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ ذہنی طور پر پریشان تھا اور اسکا لار کوں سے چھپ کر کبھی کبھی شراب پی لیتا تھا۔ جب بھی وہ ذہنی انتشار کا شکار ہوتا تو شغل باہر ڈھک کر تاتا اور اس سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح اس نے ذہنی سکون حاصل کر کے ایک بہانہ پیدا کر لیا تھا۔

وہ اسی عالم میں جلے میں آگیا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا۔ قدم ڈگدگا رہے تھے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی وہ ڈانس پر پہنچا جلے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ بکھرا ہوا مجمع اکٹھا ہونے لگا۔ لوگ صفدر بشیر کی تقریر کے انتظار میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ ایک ہیر کی طرح اٹھ کر مائیک سامنے آیا۔ حاضرین نے اس کی آمد کا پر جوش تالیوں سے خیر مقدم کیا۔ صفدر بشیر نے اپنی تقریر شروع کی۔

”دوستو! ساتھ ساتھ جی چاہتا ہے آج آپ سے کھل کر باتیں کروں۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حاضرین کی طرف دیکھا۔

سحر جلاو۔ چشم زدن میں دیکھتے ہی دیکھتے گھن گرج، کراک۔ الہامی، سر اور انتہائی غیر معمولی۔ بارہ نوشی، شراب پیانے نشے میں دھت سے چور۔ ہمہ تن گوش ہونا، مکمل توجہ کے ساتھ سنتا۔

”اس اجتماع کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہاں بہت سے کچھوے اکٹھا ہو گئے ہیں۔“
 حاضرین نے چونک کر بے چینی سے پہلو بدلے۔ صفدر بشیر کہتا رہا۔ ”جی ہاں کچھوے، ایسے
 کچھوے جنہوں نے اپنے غیر سمیٹ کر پیٹ کے اندر کر لیے ہیں اور گردن نکالے یوں دیکھ رہے ہیں
 جیسے میں کوئی مداری ہوں اور ابھی کوئی شعبدہ دکھاؤں گا۔“

اس نے ہنگلی لی۔ ذرا سا ڈنگ لگایا اور حاضرین کو گھورنے لگا۔ جلسے میں سرگوشیوں کی بھنبنہاٹ
 اڑ رہی تھی۔ کچھ لوگ ہوتن کی طرح صفدر بشیر کا منہ تک رہے تھے۔

صفدر بشیر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کچھوؤں کی چال
 بل کا زائد نہیں ہے۔ یہ سائنس کی ترقی کا عہد ہے۔ آج ایک شخص ریڈیو سے تقریر کرتا ہے اور
 ہم دنیا کے لوگ اس کو سن سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر دیکھ سکتے ہیں۔ بولتے ہوئے حرکت کرتے
 رہے ہر انداز میں ہر عالم میں۔ جناب ترقی کی اس دوڑ میں آپ کہاں ہیں؟ افسوس تو یہی ہے کہ
 آپ کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں۔ یہ گمراہی جرم ہے۔ آپ کچھوے نہ سہی، حضرت عیسیٰ کی
 پزل ہیں، جس کا جی چاہتا ہے ہانک کر لے جاتا ہے۔ جدھر منہ اٹھ گیا اسی طرف نکل گئے۔“

جلسے میں اب گڑبڑ کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ لوگوں کو اس کا انداز مخاطب سخت ناگوار گزر رہا
 تھا۔ گڑبڑ کچھوے اور بھیڑیں بننے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ وہ ہاتھ اونچے کر کے اس طرح ہمارے
 ناک بان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

”پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے۔“

”دوسری طرف سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ”ابے گھاس کھا گیا ہے؟“

کچھ لوگوں کا قاعدہ مرغ کی بولی بولنے لگے۔

”گلوں کوں، گلوں کوں۔“

اب مختلف سمتوں سے صفدر بشیر پر آوازے کسے جا رہے تھے۔ وہ ذرا سنبھلا۔ پریشان ہو کر
 دیکھنے میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ بول رہا ہوں۔“

ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اور اس کے بعد قہقہوں کی آواز دیر تک جلسے میں گونجتی رہی۔
 جلسہ درہم برہم ہو رہا تھا۔ لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ملی جلی آوازوں کا شور گونج رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے وال۔ شعبدہ، تماشا، جادو، ہوتن، بیوقوف، محق۔ انداز مخاطب: مخاطب کرنے کا طریقہ۔ آوازے کنا: مذاق اڑانا۔

علی احمد قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے صفدر بشیر کا دامن پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔ تمام اسکائی لارک بطور کا یہ عالم دیکھ کر بدحواس ہو گئے تھے۔ صفدر بشیر تقریر کرنے پر بضد تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ قدم لڑکھڑاہے تھے۔ وہ نشے کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ اب اس نے اول فول بکنا شروع کر دیا تھا اور یہ تمام آوازیں لاؤڈ اسپیکر سے نکل نکل کر گونج رہی تھیں۔ حاضرین جلسہ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ عجیب افرا تفری کا عالم تھا۔ علی احمد نے گھبرا کر ایمپلی فائرنگ کر دیا۔ لاؤڈ اسپیکر خاموش ہو گیا۔ اسکائی لارکوں نے بڑی مشکل سے صفدر بشیر کو بٹھایا۔

اب علی احمد جلے کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس نے فوراً سلمان کو اشارہ کیا۔ وہ مانگ پر پہنچ گیا۔ بیٹری کا سوئچ کھول دیا گیا۔ جلسہ گاہ میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر سلمان کی آواز ابھرنے لگی۔ حاضرین سے معذرت کر رہا تھا۔ سلمان نے ان کو بتایا کہ صفدر بشیر ایک عرصے سے بیمار ہیں۔ دن بھر ان کو تیز بخار رہا۔ چونکہ حاضرین کو ان کی تقریر سننے کا بے حد اشتیاق تھا لہذا ان کو بخار کی حالت میں یہاں لایا گیا۔ بخار بہت تیز تھا۔ سر سامی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے۔

سلمان نے یہ سب کچھ اس انداز سے کہا کہ بات بن گئی۔ ورنہ اس روز صفدر بشیر نے اسکائی لارکوں کو سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

اس افسوس ناک حادثے نے اسکائی لارکوں کو صفدر بشیر کی جانب سے سخت برگشتہ کر دیا۔ فلک پیا کے آئندہ اجلاس میں اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرنے والے تھے صفدر بشیر نے اس دوران میں اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کا ایک اور ثبوت دیا۔ یہ واقعہ ۱۱ طرح پیش آیا کہ جوہلی ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ نے چار مزدوروں کو ہر طرف کر دیا۔ یونین۔ انتظامیہ کی ایک طرفہ کارروائی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور یہ دھمکی دی کہ چاروں مزدوروں ہفتے بھر کے اندر واپس نہ لیا گیا تو ہڑتال کر دی جائے گی۔

مالکان نے یونین کا مطالبہ مسترد کر دیا اور ہر طرف شدہ مزدوروں کی ملازمت بحال کر کے صاف انکار کر دیا۔ اسی روز مزدور یونین کا جلسہ ہوا۔ اس میں صفدر بشیر اور سلمان دونوں شریک ہوئے۔ جلسے میں ہڑتال کا نوٹس دینے کی قرارداد پیش کی گئی۔ سلمان نے قرارداد کی پوری پوری

اول فول بکنا: فضول / بیہودہ باتیں کرنا۔ اشتیاق: شوق۔ سر سامی کیفیت: حیرت کی حالت جس میں مریض اول فول بکنا شروع کر دیتا ہے۔ برگشتہ: ناراض، خلاف۔

بیکہ۔ مگر صفدر بشیر ہڑتال کا مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مزدوروں کی تنظیم ابھی مضبوط نہیں ہے۔ لہذا کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے۔ لیکن مزدوروں میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ انہوں نے صفدر بشیر کی رائے سے اتفاق نہ کیا اور ہڑتال کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی گئی۔

ہڑتال کے دوسرے دن مزدوروں نے کارخانے کے سامنے مظاہرہ کیا۔ ان مزدوروں کو دیکھ کر کارخانے کی کوشش کی جو ڈیوٹی پر جانا چاہتے تھے۔ کارخانے کے جنرل منیجر نے فوراً پولیس بلوائی۔ مگر نہ کوئی ہنگامہ برپا ہوا نہ گڑبڑ۔ مظاہرین پر امن تھے۔ ہڑتال بہت کامیاب جا رہی تھی۔ منتظمین کو یہ پر امن مظاہرہ خطرناک معلوم ہوا۔ چنانچہ انہوں نے سہ پہر کو اپنے کچھ غنڈے بھیج کر بلوہ کرادیا۔ پولیس نے ہنگامے پر قابو پانے کے لیے مزدوروں پر بار بار لاٹھی چارج کیا۔ اس لاٹھی چارج سے ان مزدوروں زخمی ہو گئے۔ مظاہرین کو منتشر ہونا پڑا۔ اسی روز کارخانے کے گرد ونواح کے علاقے پر دھڑا دھڑا فوج کر دی گئی۔

اس تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے رات کو یونین کا ہنگامی جلسہ طلب کیا گیا۔ اس روز کارخانے کے دفتر پر پولیس کے چھاپہ مارنے کا خطرہ تھا اور کچھ گرفتاریوں کی افواہ بھی گرم تھی اس لیے نور بشیر اس جلسے میں شریک ہونا نہ چاہتا تھا۔ یوں بھی اسے یونین کے کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ فلک پیا کو اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اس نے ایک بار زور بھی دیا تھا کہ اسکائی لارکوں اور تحریک میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ انہیں اپنی سرگرمیاں صرف سماجی بہبود کے کاموں تک محدود رکھنا چاہیے۔ وہ فلک پیا کو صرف ایک فلاحی تنظیم کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

سر شام ہی وہ ہیڈ کوارٹر سے اپنی کوٹھی چلا گیا اور یونین کے جلسے میں شرکت نہیں کی۔ جلسے غیر حاضری کے لیے اس نے بیماری کا عذر پیش کیا۔ مگر اسکائی لارکوں نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ وہ خان بہادر فرزند علی کے ساتھ اس شب بادہ و ساغر کا لطف اٹھا رہا تھا۔

صفدر بشیر کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے نے اسکائی لارکوں کو مشتعل کر دیا۔ ان کے مطالبے کے مطابق ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ صفدر بشیر جلسے میں موجود تھا۔ وہ ایک ملزم کی طرح خاموش بیٹھ رہا۔ پر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ نہ اس نے کسی سے بات کی نہ کسی سے چینی کا مظاہرہ کیا۔ پتھر کے مجسمے کی طرح چپ بیٹھا رہا۔

جلے کی صدارت فہیم اللہ کر رہا تھا۔ اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی تو سلمان نے صندوق کے خلاف چارج شیٹ پیش کی۔ بہت سے الزامات کے علاوہ اس کے خلاف سب سے بڑا چارج یہ تھا کہ وہ خان بہادر فرزند علی سے ساز باز کر کے فلک پیا کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ صفدر بشیر نے سنگین الزامات سے تو غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہ فلک پیا کا صدر تھا۔ اس کا بانی تھا اور اسے باقاعدہ تحریک کی شکل دینے میں اس نے ساٹھ ہزار روپیہ دیا تھا۔ سخت جدوجہد کی تھی اور عیش عشرت کی زندگی تھج کر روکھی پھمکی بے مزہ زندگی اختیار کی تھی۔ فلک پیا کے خلاف سازش کرتے الزام عائد کر کے اس کے ساتھ سخت زیادتی کی گئی تھی۔ یہ بات کبھی اس کے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔ اسے فلک پیا سے صرف اس قدر شکایت تھی کہ ڈاکٹر زیدی کے بجائے میو سٹلے انتخابات میں اسے فلک پیا کا امیدوار کیوں نامزد نہیں کیا گیا۔ وہ خود کو ڈاکٹر زیدی سے زیادہ بہتر مستحق امیدوار سمجھتا تھا۔ اسکاٹی لارکوں نے یہ فیصلہ کر کے اس کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ جہاں تک خان بہادر کے ساتھ ساز باز کرنے کا سوال تھا صفدر بشیر کو خود بھی خان بہادر سے شدید لڑائی تھی۔ بات صرف اس قدر تھی کہ اس شام جب وہ فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر سے اپنی کوٹھی کی جانب جا رہا تھا تو راستے میں خان بہادر مل گیا اور اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں خان بہادر نے انکٹ کے متعلق اس سے گفتگو کرنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس نے خان بہادر کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

چارج شیٹ پیش کرنے کے بعد سلمان نے یہ مطالبہ کیا کہ صفدر بشیر کو صدر کے عہدے۔ فوری طور پر معطل کر دیا جائے اور اس کے خلاف باقاعدہ تحقیقات کر کے سخت کارروائی کی جائے۔ صدر نے صفدر بشیر کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا۔ مگر وہ غصے سے اس قدر بے ہوش ہوا تھا کہ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا اور احتجاجاً اجلاس سے واک آؤٹ کر گیا۔ صفدر بشیر کے چلے جانے کے بعد بھی اجلاس کی کارروائی جاری رہی۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد صفدر بشیر کا ڈرائیور آیا۔ وہ جنرل سیکرٹری علی احمد کے نام ایک خط لایا تھا۔ یہ صفدر بشیر کا دستخط تھا۔ اس نے فلک پیا سے علیحدگی اختیار کرنے کی درخواست کی تھی۔ علی احمد کو یہ علم نہیں تھا کہ جذبات کی رو میں وہ اتنی دور نکل جائے گا۔ اس نے اسے سختی پڑھ کر

دوسرائی لار کوں سے اپیل کی کہ فی الحال اس پر کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ فلک پیما کے آئندہ اجلاس میں
 انہی غور کیا جائے۔ اس تجویز کو مان لیا گیا اور صفدر بشیر کے استعفیٰ پر اس روز کوئی بحث نہ ہوئی۔

(۳)

مئی کی شروع تاریخیں تھیں۔ میونسپلٹی کے انتخابات میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے۔ تمام
 ان لوچلتی۔ آسمان پر گہرا زرد غبار چھایا رہتا۔ درختوں کے پتے جھلس گئے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں
 ہم موم بنی کی طرح پکھلتے تھے۔ پہر دن گزرتے ہی شہر میں سناٹا پڑ جاتا۔ دوپہر تک کوچہ و بازار
 نہان ہو جاتے۔

گرمیوں کی ایک ایسی ہی سنسان دوپہر تھی۔ علی احمد کمرے میں بیٹھا ایک نیا انتخابی پوسٹریار کر
 تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھول کر سلمان داخل ہوا۔ اس کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے متمتا
 تھا۔ بالوں پر گرد کے ذرات بکھرے تھے۔ بدن پسینے سے شرابور تھا۔ علی احمد نے گردن موڑ کر اس
 جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔

”کیا خبر لائے ہو اس کائی لارک سلمان؟“

سلمان نے ہاتھ میں دبا ہوا تھیلا میز کے ایک کونے پر رکھ دیا اور چہرے سے پسینہ پونچھتے
 لے گیا ہوا۔ ”ابھی ابھی ایک بڑی شاندار خبر ملی ہے۔“

”شاندار خبر ہے تو ضرور سناؤ۔“

”ایک حریف تو میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔“

علی احمد چونک پڑا۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا؟“

”عبدالحمید تو اڑن چھو ہو گیا۔“ سلمان اس وقت بڑی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ ”آج اس
 سناٹاؤں تاخیر دگی بھی واپس لے لیے۔“

”کہہ بھر کے لیے اس نے توقف کیا۔“ ”کہتے ہیں نا، زوردار خبر۔ اب تو صرف خان بہادر ہی
 بولان میں رہ گیا ہے اور وہ بھی کیا؟“ یہ کہہ کر سلمان نے قہقہہ لگایا۔ مگر اس اطلاع پر علی احمد نے

”نہیں! وہاں قتل ہو گیا۔“

کسی مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اسے اس طرح خاموش پا کر سلمان کو کسی قدر تعجب ہوا۔ ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔
خاموش کیوں ہو گئے؟“

علی احمد نے آہستہ سے کہا۔ ”بھی یہ تو کچھ اچھی خبر نہیں ہے۔“

سلمان حیرت سے چونک پڑا۔ ”کیوں؟“

”میرے اندازے کے مطابق اسے دو ہفتے پہلے ہی انتخابات سے دست برداری کا اعلان

چاہیے تھا۔ مجھے خود حیرت تھی کہ عبد الحمید ابھی تک کیوں ڈٹا ہوا ہے؟“

سلمان اس کی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ ”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا؟“

علی احمد اسے سمجھانے لگا۔ ”تم نے غالباً غور نہیں کیا کہ عبد الحمید کے بیٹھ جانے سے
کسے پہنچے گا۔ اگر عبد الحمید الیکشن لڑتا تو خان بہادر کے ووٹ تقسیم ہو جاتے۔ اس کے زیادہ
متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایسا طبقہ ہے کہ جو کسی بھی وقت جذباتی فردوں سے گرا
ہمارا مخالف بن سکتا ہے۔ اس کے طبقاتی کردار کا یہی تقاضا ہے۔ یہ ناقابل اعتماد طبقہ ہے۔ ار
ڈانواں ڈول اور ڈھللی یقین کہ اس پر قطعی انحصار نہیں کیا جاسکتا۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور سلمان سے دریافت کیا۔ ”یہ تو بتاؤ صفر بشیر کس عالم میں ہے؟“

سلمان نے مختصر جواب دیا۔ ”مجھے ان کے متعلق کوئی خاص اطلاع نہیں۔ صرف اتنا

کہ اب وہ کثرت سے شراب پینے لگے ہیں اور ان کا مزاج بھی بہت چڑچڑا ہوا گیا ہے۔“

علی احمد کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس خبر سے اسے بہت صدمہ پہنچا

نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”وہ اپنی جذباتیت اور خود پسندی کا شکار ہو گیا۔ ہائے بے چارہ صفر بشیر

ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سلمان سے کہا۔

”عبد الحمید کی کنارہ کشی کسی صورت میں ہمارے لیے مفید نہیں۔ اس کے سارے ووٹ

بہادر کے حق میں جائیں گے۔ فلک پیا کی جڑیں کہیں مضبوط ہیں تو وہ علاقے کے غریب اور

لوگ ہیں۔ کارخانوں کے مزدور ہیں جو ہمارے بچے ووٹ ہیں۔ ہمیں یونین میں اپنا کام ختم

چاہیے۔ یوں بھی اب ہمیں اپنی انتخابی مہم زیادہ تیز کرنا پڑے گی۔“

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہا۔ علی احمد نے سگریٹ کا پیکٹ

ایک مگرٹ سلمان کو دی۔ دوسری اپنے ہونٹوں میں دبائی اور اسے سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا کرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر لو کے جھکڑ غراتے ہوئے چل رہے تھے۔ قریب کے اصطلیل مٹا بندھا ہوا گھوڑا بار بار ہنہنا رہا تھا۔ سنسان دوپہر میں اس کی آواز کسی پاگل کی چیخوں کی طرح ڈنک معلوم ہو رہی تھی۔

ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں علی احمد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے خان بہادر نے عبدالحمید کو گٹھڑی رقم دی ہے ورنہ وہ آسانی سے بیٹھنے والا امیدوار نہیں تھا۔ بہر حال خان بہادر کی پوزیشن اب کسی قدر مضبوط ہو گئی ہے۔“ وہ سلمان کی اطلاع پر تبصرہ کرتا رہا۔ چند منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

مفتلوا ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی۔

سلمان نے اپنا تھیلا اٹھایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ علی احمد پوسٹر تیار کرنے میں مشغول وگا۔ کمرے میں ایک بار پھر سکوت ہو گیا۔ باہر لو کے جھکڑوں کی سرسراہٹیں ابھرتی رہیں۔ کمرے لاکڑی کا ایک پٹ آہستہ آہستہ بجتا رہا۔

علی احمد کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ دوسرے ہی دن عبدالحمید کی جانب سے جاری کئے جانے والے بڑے بڑے پوسٹر جگہ جگہ نظر آنے لگے۔ ان پوسٹروں میں عبدالحمید نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ خان بہادر کے حق میں انتخابات سے دستبردار ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے دو ٹروں سے اپیل کی تھی کہ وہ خان بہادر کی پوری طرح حمایت کریں۔

اس اعلان کا فوری رد عمل یہ ہوا کہ خان بہادر کے حامیوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور وہ بڑھ بڑھ کر کام کرنے لگے۔ چند ہی روز بعد انہوں نے جلسہ عام کا بندوبست کیا۔ یہ انتخابی مہم کے سلسلے میں خان بہادر کی جانب سے پہلا جلسہ تھا۔ اس سے قبل وہ عام جلسہ کراتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ظاہر یہ تھا کہ کہیں جلسہ ناکام نہ ہو جائے اور یہی سہی ساکھ بھی جاتی رہے۔ اس کے کارکنوں کے واسطے اور پست ہو جاتے۔

جلسہ کامیاب بنانے کے واسطے بہت زور و شور سے تیاریاں کی گئیں۔ ہر طرف قد آدم پوسٹر لٹائے گئے۔ خان بہادر کی دو چھپیں رات گئے تک لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے جلسے کا اعلان کرتی رہیں۔

ان تیار یوں کو دیکھ کر اسکاٹی لار کوں میں بے چینی پھیل گئی۔ چنانچہ فلک بیا کے ایک اجلاس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ خان بہادر کے جلسے کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ چند جو شیے اسکاٹی لارک اس حد تک کمر بستہ تھے کہ جلسے گاہ کے اندر گھس کر بجلی کے تار کاٹ دئے جائیں۔ ہڑ بونگ ہار جلسہ درہم برہم کرنے کی کوشش کی جائے۔

مگر علی احمد نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔

اس نے کہا کہ اسکاٹی لارک اپنے مخالفین کو قوت کا مظاہرہ کرنے کا موقع نہیں دیں گے تو اپنی صفوں کو حریف کے خلاف کبھی مستحکم نہ بنا سکیں گے۔ انہیں اپنی کمزوریوں کا اندازہ نہ ہو سکے گا اس کے نزدیک یہ بزدلی کی نشانی تھی۔ علی احمد اور بعض دوسرے اسکاٹی لار کوں کی مخالفت پر اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔



خان بہادر نے جلسے پر خوب روپیہ صرف کیا تھا۔

پنڈال دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ چپے چپے پر رنگ برنگے برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ شیش کئی گزاوچی بنائی گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف درتار پردوں کی محرابیں تھیں۔ بیچ میں فانوس لگے رہے تھے۔ دبیز قالینوں کا فرش تھا جس پر صدر کے لیے ایک اونچی کرسی تھی۔ اس پر سرخ مٹیاں غلاف تھا۔ ہوا چلتی تو زرتار پردے لہراتے۔ ہر طرف ستاروں کی افشاں بکھر جاتی۔ شیشیں سے آراستہ بارہوری کی طرح شاندار نظر آتی۔

جلسے کا انتظام رفعت علی دل گیر کے سپرد تھا۔ وہ پستہ قد کا ادھیڑ آدمی تھا۔ چہرے پر بڑے ڈاڑھی لمبی، کاکلیں اور ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھایا ہوا عصا۔ اس جلسے میں وہ ان صوفیوں کی طرح نظر آتا تھا جن کو محفل سماع کی زینت کے لیے خاص طور پر بلایا جاتا ہے۔ جو قوالوں کو کچھ کوڑی تو دیتے نہیں البتہ عالم وجد میں اس طرح بے خود ہو جاتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ دل گیر کا تصوف اور کشف و کرامات سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ یہ وضع قطع اس نے محض اپنی شخصیت کو باوقار بنانے کے لیے اختیار کی تھی۔

کمر بستہ: آدابہ تیار۔ معتمد: مضبوط۔ پنڈال: مراد جلسے کی جگہ۔ پستہ قد: چھوٹے قد کا۔ چلی ڈاڑھی: کم بالوں والی ڈاڑھی۔ کاکلی: لٹ۔ عصا: لاشی۔ عالم وجد: دیوانگی کی حالت، بیخودی کی حالت۔ تصوف: بیخودی فیضی۔ کشف: غیب سے کسی چیز کا علم ہونا۔

دگیر جلسوں کو کامیاب بنانے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ ویسے پیشے کے اعتبار سے وہ درزی تھا۔ شہر
 مٹاس کی دکان بھی تھی۔ مگر الیکشن کے دنوں میں وہ انتخابات لڑانے اور انتخابی جلسے کرانے کا کام
 بھی کرتا تھا اور ہمیشہ ٹھیکے پر کرتا تھا۔ ایک زمانے میں اس کی باقاعدہ ٹولی تھی جن میں نعرہ لگانے
 والے، نعرہ اٹھانے والے، تالیاں بجانے والے اور ایسے مضبوط غنڈے بھی تھے کہ اگر کسی نے ذرا
 بھی جلسے میں گڑبڑ کی تو فوراً اس کی گردن دبوچ لیتے۔ مگر اب اس کی ٹکڑی منتشر ہو گئی تھی۔ البتہ
 ہاں ساکھ باقی تھی۔

جلسہ شروع ہونے کا جو وقت مقرر تھا رفعت علی دل گیر اس سے گھنٹہ بھر پہلے ہی جلسہ گاہ
 میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے پنڈال کا گھوم پھر کر باقاعدہ معائنہ کیا۔ اس کے ہمراہ ۱۲۵ افراد کی ٹیم تھی۔
 دل گیر نے ہر ایک کو مختلف مقامات پر تعینات کیا۔ نعرہ لگانے والوں کو ہدایتیں دیں کہ پہلے کون ابتدا
 کرے گا اور اس کے بعد کس طرح سب مل کر نعرہ لگائیں گے۔ تالیاں پیٹنے والے کس موقع پر
 ہاں بجائیں گے۔ جب تک وہ سنگل نہیں دے گا نہ کوئی نعرہ لگائے گا نہ تالیاں بجائی جائیں گی۔

وہ ایک روز قبل باقاعدہ ریہر سیل بھی کر چکا تھا۔ مگر اس کے بیشتر کارکن اناڑی تھے۔ جلسہ
 شروع ہونے سے پہلے وہ انہیں بار بار ہدایتیں دے رہا تھا اور ڈانٹا بھی جا رہا تھا۔ ”دیکھو بے! کسی نے
 ان ہدای کی حرکت کی تو دھیلا نہیں دوں گا۔“ ان کے ریٹ کچھ اس طرح مقرر تھے۔

نعرہ لگانے والے فی کس پانچ روپے۔

نعرہ اٹھانے والے فی کس دو روپے۔

تالیاں بجانے والے فی کس ایک روپیہ۔

اس کے علاوہ دگیر نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ جو بہت زوردار اور جوشیلے نعرے لگائے گا اسے
 نام بھی ملے گا۔

ان تیاریوں سے فارغ ہونے کے بعد دگیر نے غنڈوں کی ڈیوٹیاں مقرر کیں۔ ان کو اچھی
 طرح سمجھا کر وہ خان بہادر کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

شام ہی سے لوگ جلسہ گاہ میں پہنچنا شروع ہو گئے۔ خان بہادر کی آمد سے پہلے ہی پنڈال
 کا کمر مریا۔ ہزاروں کا اجتماع تھا۔ حاضرین میں بڑی تعداد خان بہادر اور اس کے حامی کارخانہ

ملکوت علی شاہ تھی۔ تاہم یہ کار سمجھ بہت زیادہ۔

داروں کی فیکٹریوں اور ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تھی، جنہیں بسوں میں بھر کر جلسہ گاہ تک لایا گیا تھا۔ انہیں جلسے میں شرکت کرنے کے لیے باقاعدہ اور ٹائم دیا گیا تھا۔

آٹھ بجنے سے کچھ دیر قبل خان بہادر فرزند علی کی کار جلسہ گاہ پر آکر رکی۔ اس کے کار کی چیلوں کی طرح کار پر جھپٹے۔ ایک نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ خان بہادر بڑے وقار کے ساتھ باہر آئے کارکنوں اور عقیدت مندوں نے بڑھ بڑھ کر اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ دلیکیر نے فرائعہ لگانے والوں کو اشارہ کیا۔ فضا ”خان بہادر زندہ باد“ کے نعروں سے گونجنے لگی۔

خان بہادر، کارکنوں اور عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں مسکراتا ہاتھ ملاتا آگے بڑھ خلقت اس پر اس طرح ٹوٹ رہی تھی کہ شہ نشین تک پہنچنے میں دس منٹ لگے۔

شہ نشین پر پہنچ کر خان بہادر فرزند علی نے جلسے پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی گئیں۔ اتنا بڑا اجتماع اس کے سامان گمان میں بھی نہ تھا۔ مسرت سے اس کا چہرہ دمک اٹھ رہا تھا۔ وہ شہنشاہ سے جھگمگاتے پنڈال میں، ہار پھولوں سے لدا، وہ دولہا کی طرح سجا سجاوہ، مہمان خصوصی بنا ایک اونٹنی کرسی پر رونق افروز تھا۔ ہر نگاہ اس کی جانب اٹھی تھی اور ہر زبان پر اس کا تذکرہ تھا۔ اس حقیقت کا خان بہادر کو شدت کے ساتھ احساس بھی تھا۔

خان بہادر فرزند علی کے ساتھ نیاز بھی جلسے میں آیا تھا۔ اس نے یہ آن بان اور کرد و فردیکھا خان بہادر کی شخصیت سے بہت مرعوب ہوا۔ اس کے سامنے دور تک انسانی چہرے ہی چہرے نظر آرہے تھے اور یہ سب خان بہادر کے حامی اور مددگار تھے۔ نیاز نے دل ہی دل میں کہا کہ واقعی خان بہادر فرزند علی بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ بار بار خان بہادر کی جانب دیکھتا جو اونچی کرسی پر کسی فرماں روا کی مانند فروکش تھا۔ اس کی گردن فخر سے اوپر اٹھی تھی۔ چہرے پر وقار اور گہری سنجیدگی چھائی تھی۔ جلسے کی کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ ایک مقرر نے کھڑے ہو کر تقریر کی۔ اس نے خان بہادر کی شان میں خوب خوب قصیدہ خوانی کی۔ اس کے بعد کئی دوسرے مقررین نے تقریریں کیں۔ ہر تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ خان بہادر، عوام کا مخلص رہنما، سچا اور صالح مسلمان ہے۔ اس کے سینے میں ایمان کی حرارت اور غریبوں کی خدمت کا جذبہ موجزن ہے۔ وہ ان کے

جھرمٹ: جھوم۔ خلقت: عوام۔ سامان گمان: وہم و خیال۔ رونق افروز تھا: بیٹھا ہوا تھا۔ آن بان، کرد و فردیکھا: شان و شوکت، غلامانہ لب لباب: غلامانہ۔

بڑوں کا صحیح ہتھ مار ہے۔

قریب قریب ہر مقرر نے ”نورانی مسجد“ کی تعمیر کو خان بہادر فرزند علی کی مگر اس قدر خدمت و ایمان افروز کارنامہ قرار دیا۔ انہوں نے خان بہادر کو عوام کا نمائندہ ثابت کرنے میں فصاحت و بفت کے وہ جوہر دکھائے کہ خان بہادر کے پیسے وصول ہو گئے۔

ان تقریروں کے دوران میں رفعت علی دل گیر اور اس کی ٹیم نے اس قدر جوش و خروش سے رہے لگائے کہ جلسے میں زبردست گرمی پیدا ہو گئی۔ لیکن جوں جوں تقریر کرنے کا وقت قریب آتا رہا تھا خان بہادر کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے آج تک کسی جلسہ عام سے خطاب نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ گھر سے یہ سوچ کر چلا تھا کہ اپنی تقریر سے دھوم مچا دے گا۔ یہ تقریر اس نے بلکہ مشق اخبار نویس سے لکھوائی تھی اور کئی روز تک بند کمرے میں ٹہل ٹہل کر اسے رٹا تھا۔ بچنے کے سامنے کھڑے ہو کر چہرے پر مختلف انداز سے تاثرات پیدا کرنے کی باقاعدہ مشق بھی کی تھی۔ ایک بار کنبے کے تمام افراد اور گھر کے تمام نوکروں کو اکٹھا کر کے ان کے روبرو تقریر کا یہرسل کیا تھا۔ مگر اب اتنا بڑا مجمع دیکھ کر وہ کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

آخر خان بہادر بولنے کے لیے کھڑا ہوا۔ تقریر شروع کرنے سے پیشتر اس نے پورا گلاس پانی پی لیا۔ مگر وہ تقریر جو رٹ کر آیا تھا اس کے ذہن سے نکلتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی یادداشت پر زور دے کر اسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے

”نعرہ بکیر!“

اور اس کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے آوازیں آئیں۔

”اللہ اکبر۔“

”خان بہادر فرزند علی زندہ باد“

”خان بہادر فرزند علی زندہ باد“

ان نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ خان بہادر کی یادداشت بالکل جواب دے گئی۔ بدحواس ہو کر لڑنے لگا۔ اس کے دو تین لمبے لمبے کش لگائے۔ اس کے پیر آہستہ آہستہ کپکپا رہے تھے۔ تنفس تیز

نعرہ بکیر۔ بلاغت، حکام میں پھٹی، کہنہ مشق، تجربہ کار۔ رٹا، زبانی یاد کرنا۔

ہو گیا تھا اور سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ اس نے اسی عالم میں تقریر شروع کر دی۔
 ”برادران اسلام! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے آپ سے صرف چند ضروری باتیں کہنی ہیں۔“

یہ دونوں جملے اس نے بڑی مشکل سے ادا کئے۔ اس کی آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔ مگر خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میں آپ لوگوں کا خادم ہوں۔ آپ لوگوں کی خدمت کر چاہتا ہوں۔“

اسے اپنی تقریر کا کچھ حصہ یاد آ گیا۔ اس نے فوراً کہا۔ ”لیکن یہ بات تو ہر امیدوار آپ سے کہے۔ ہر ایک کے دل میں آپ کی خدمت کا جذبہ ہے۔ ہر ایک آپ کے غم میں گھلا جاتا ہے۔ وہ آپ میری بات پر یقین کیوں کریں؟ آپ کہیں گے کہ خان بہادر ووٹ لینے کے لیے یہ سہ ڈھونگ رچا رہا ہے۔ وہ پرلے درجے کا عیار اور مطلبی ہے۔“

خان بہادر کی تقریر ایسے موڑ پر آ گئی تھی جہاں سے گریز اختیار کر کے وہ حرف مطلب پر آ چاہتا تھا۔ اتفاق سے عین اس وقت رفعت علی دل گیر کے سر میں کھلبلی ہوئی۔ اس نے سر کھجانے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ ایک تالی بجانے والے کی نظر پڑ گئی۔ وہ سمجھا دل گیر سگنل دے رہا ہے۔ اس قریب بیٹھے ہوئے اپنے ساتھی کو کہنی سے ٹھوکا دیا اور زور زور سے تالی بجانے لگا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی تالی بجانے لگے۔

تالیوں کا شور سن کر مشرقی کونے پر کھڑے ہوئے نعرہ لگانے والے نے اپنی مستعدی ثبوت دیا۔ اس نے فوراً گلا پھاڑ کر نعرہ لگایا۔

”سچ کا بول بالا۔“

”جلے سے ملی جلی آوازیں ابھریں۔“ جھوٹے کامنہ کالا۔“

”دو حائد لی بازی!“

”نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی۔“

”دو ٹوں کی دلا لی۔“

”نہیں چلے گی، نہیں چلے گی۔“

ماضیٰ میں جلسہ بھی ان نعروں میں شریک ہو گئے۔ ان کی آواز کے شور سے جلسہ گاہ گونجنے لگی۔ یہ نعرے دراصل اسکائی لارکوں کے تھے اور خان بہادر کے کارکنوں نے انہیں کے خلاف پھیل کرنے کے لیے دل گیر کے گروگوں کو رٹائے تھے۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ خان بہادر جب اسکائی لارکوں کی مذمت کرے تو وہ یہ نعرے لگانا شروع کر دیں۔

خان بہادر نے یہ نعرے سنے تو گھبرا کر سوچا کہ جلسے میں گڑبڑ ہو گئی۔ اس کی مخالفت میں بے لگائے جا رہے ہیں۔ تقریر کا وہ حصہ جو اسے یاد آیا تھا، ذہن سے نکل گیا۔ دوسری طرف دل بڑی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ خان بہادر کی نظروں سے بچتا پھر رہا تھا۔ غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔ ”ساروں نے میری ناک کٹوا دی۔ کسی حرام کے ختم کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ یارو! غضب رکھا۔“

غصے سے اس کی چٹکی ڈاڑھی بکری کی دم کی طرح ہل رہی تھی۔ نتھنوں سے سانس، شوشوں کے نکل رہی تھی۔ اس وقت وہ اچھا خاصا ناک کا مسخرا نظر آ رہا تھا۔

خان بہادر غضب ناک ہو کر چیخا۔ ”بعض لوگ جلسے میں گڑبڑ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کو بتا رہا ہوں کہ ہم موم کے بنے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔“ دل گیر نے دیکھا موقع غنیمت ہے۔ اس نے فوراً سگنل دیا اور جلسہ ”اللہ اکبر“ اور ”خان بہادر بہادر“ کے نعروں سے گونجنے لگا۔

دل گیر کو سرخ رو ہونے کا موقع ملا تھا۔ اب وہ ایسے مقام پر کھڑا ہو گیا جہاں سے خان بہادر سے دیکھ سکتا تھا۔ ان نعروں نے واقعی اثر کیا۔ خان بہادر جوش میں آ کر بولنے لگا۔ ”میں اپنے متعلق اللہ اعزّازہ سے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مگر میری خدمات آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ نورانی ہو کر نے بنوائی؟“

ثالث اعمال کسی دل جلے کی زبان سے نکل گیا۔ ”مسجد کی دکانوں کی ڈیڑھ لاکھ پگڑی کس نے“

دل گیر کے گرے چیلوں کی طرح اس شخص پر جھپٹے اور لائیں اور گھونسنے مارتے ہوئے جلے

مسخرہ: جلسہ کے ناک کشا: روسوا کرنا، بدنام کرنا۔ ناک: ڈرامہ۔ مسخرہ: ہنسی مذاق کرنے والا۔ سرخ رو ہونا: ذمہ داری بھانا۔ ثالث: درمیان

سے باہر لے جانے لگے۔

اس روئے پر حاضرین نے احتجاج کیا۔ جلسے میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے غنڈوں کی گرفت سے اس شخص کو چھڑانے کی کوشش کی تو ہاتھ پائی شروع ہو گئی۔ پھر تو اس قدر ہنگامہ ہوا کہ غل غپاڑہ ہوا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا اسی طرف بھاگا۔ خان بہادر نے یہ عالم دیکھا تو بھی بدحواس ہو گیا۔ چپکے سے شہ نشین سے اتر اور کارکنوں کے حلقے میں گھرا ہوا جلسے سے باہر نکلا۔ کارکنوں اور اس میں بیٹھ کر سیدھا گھر کی جانب چل دیا۔

بھگدڑ پڑنے کے بعد آنا فانا پنڈال خالی ہو گیا۔ جلسہ گاہ میں آلو بولنے لگا۔ اب صرف کارکن اور دل گیر شامیانے کے نیچے رہ گئے تھے۔ دل گیر سخت برہم نظر آ رہا تھا۔ اس کے گرجے سر جھکائے ملازموں کی طرح کھڑے تھے۔ وہ ان کے سامنے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ زیادہ تاؤ آتا تو ان پر برسنے لگتا۔

”ابے تم نے مجھے کہیں کانہ رکھا۔ اب میں خان بہادر کے پاس کس منہ سے جاؤں۔ یاد کرو کسی سالے کو ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ میرا تو بیڑا غرق ہو ہی گیا مگر تم کو بھی نہیں بخشوں گا۔ اب تم کس کس طرح سمجھایا۔ مگر سب نے اپنا حرامی پن دکھایا۔ یادو! ذرا تو عقل سے کام لیا ہوتا۔ تھپہ تم پر۔ اتنے ڈھو جو ان ہو کر تمہاری یہ حرکتیں۔“

وہ دیر تک ان کو ڈانٹتا پھنکارا رہا اور بے چینی سے ٹہلتا رہا۔

رفعت علی دل گیر شرم کے بارے خان بہادر کے پاس نہ گیا۔ پنڈال سے نکل کر سیدھا دارو خانے پہنچا۔

لیکن خان بہادر کو اس سے ذرا بھی شکایت نہ تھی۔ اس نے جلسے کے درہم برہم ہو جانے کا ساری ذمہ داری اسکاٹی لار کوں پر عائد کی۔ وہ اپنے کارکنوں کے ساتھ بیٹھا سارا غصہ اسکاٹی لار کوں پر اتار رہا۔

کارکن بھی اس کی تائید کر رہے تھے۔

رات گئے تک خان بہادر کی کوٹھی پر یہی چرچا رہا۔ آئندہ کے لیے نئے انتخابی جھنڈے اور اسکیس سوچی گئیں اور یہ طے کیا گیا کہ جوابی کارروائی کے طور پر اسکاٹی لار کوں کے ہر جلسے کو باغی

بنا اور عزت کے ذریعے درہم برہم کر لیا جائے۔



اسکائی لارکوں نے بھی جلسہ عام کیا۔ حاضرین کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ ان میں جوش و
ش بھی تھا۔ سلمان تقریر کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ صاف ستھرا تھا۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ انتخابی
کے سلسلے میں تقریریں کرتے کرتے اب وہ خاصا منجھ گیا تھا۔ لوگوں کی نفسیات سمجھنے لگا تھا۔
انہوں نے اس کا اپنا اسٹائل بناتا جا رہا تھا۔ وہ ایک کامیاب مقرر سمجھا جانے لگا تھا۔

سلمان نے دور ان تقریر ایک بار آواز اونچی کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی پریشان حالی کی بنیادی
یہ ہے کہ آپ کو اپنی قوت کا اندازہ نہیں۔ آپ اپنے حقوق اور ان کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔“
ان بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ اچانک جلسے کے اندر سے کئی آوازیں ابھریں۔

”جھوٹ بولتا ہے۔“

”بہر دیا ہے۔“

”سب ووٹ مانگنے کا ڈھونگ ہے۔“

”ہم تقریر نہیں سنیں گے۔“

”واپس جاؤ، واپس جاؤ“

اس کے ساتھ ہی غل غپاڑہ ہونے لگا۔ چیخ چیخ کر بولنے والوں کی آوازوں کے ساتھ مرغوں
نالی کی بولیاں بھی سنائی پڑ رہی تھیں۔ سلمان کسی قدر گھبرا گیا۔ یہ اس کے ساتھ پہلا اتفاق تھا۔
نے لوگوں سے خاموش رہنے کی درخواست کی تو شور مچانے والے اور بھی اونچی آواز سے چیخنے
پہ آوازیں کچھ اس طرح گھل مل گئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

جلسے میں پہلے تو کچھ سراپیمگی پھیلی۔ کچھ لوگ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ بچوں کے بل اونچے
اس طرف دیکھنے لگے جس طرف شور ہو رہا تھا یہ پندرہ بیس افراد کا غول تھا جس میں ہر شخص
اٹھا اٹھا کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ مگر وہ زیادہ دیر شور نہ مچا سکے۔ حاضرین میں سے کچھ نوجوان
اور ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ دنگا فساد کرنے لگے۔ یہی ان کے حق میں برا ہوا۔

ایک ایک ان پر چاروں طرف سے مار پڑنے لگی۔ کچھ تو یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے ہی صاف نکل گئے۔
نہ کو کھڑا کیا ان پر دھڑا دھڑا جوتے پڑنے لگے۔ ذرا ہی دیر میں ان کی اچھی خاصی مرمت ہو گئی۔

اسکائی لارکوں نے منت سماجت کی۔ بڑی مشکل سے ان کی گلو خلاصی ہوئی۔

ہنگامہ ختم ہونے کے بعد جلسہ پھر شروع ہو گیا اور رات گئے تک جاری رہا۔ سلمان نے اور بھی زیادہ جوش و خروش سے تقریر کی اور یہ حقیقت ہے کہ اس کی یہ تقریر بڑی ولولہ انگیز تھی۔ لوگ بارے بارے لگا رہے تھے۔ ان نعروں کی آوازیں رات کے سناٹے میں دور تک سنائی پڑ رہی تھیں۔ اسی رات فلک پیمانہ اجلاس ہوا جس میں جلسے کے اندر ہونے والی گڑبڑ پر غور کیا گیا۔ اس لیے کہ یہ ابتدا تھی۔ اور آئندہ کے واسطے اسکائی لارکوں کو تنبیہ بھی تھی۔ اجلاس میں بڑی بے چارہ جاتی تھی۔ اسکائی لارک اس واقعے پر بہت برہم تھے اور اونچی آوازوں سے بول رہے تھے۔



کمرے میں سگریٹوں کا دھواں منڈلا رہا تھا۔ لیپ کے چاروں طرف سرمئی غبار کا جال بکھلا گیا تھا۔ اس کی روشنی دھندلی پڑ گئی تھی اور اس دھندلی روشنی میں اسکائی لارکوں کے چہرے چھائیوں کے مانند نظر آرہے تھے۔ فضا کچھ ایسی ہی دھواں دھواں تھی۔ ناگاہ دروازہ آہستہ سے چرچاتا ہوا کھلا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی اسکائی لارکوں نے چونک کر دیکھا۔ دروازے کے پھر بیچ صفدر بشیر کھڑا تھا۔ اس کے بال پٹ سن کے ریشوں کی طرح خشک تھے۔ پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔ چہرے کا رنگ خاکستری پڑ گیا تھا۔ خساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کے درمیان اس کا دھڑکنا ہوئی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

صفدر بشیر لمحہ بھر تک دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ آہستہ آہستہ آواز بڑھنے لگا اس کے قدموں کی آہٹ پختہ فرش پر کھٹ کھٹ ابھرتی رہی۔ وہ علی احمد کی پشت پر چڑھا۔ چٹان کی طرح استاد ہو گیا۔ ذرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں صفدر بشیر کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جناب صدر اور اسکائی لارک ساتھیو! اس بے جا مداخلت کے لیے میں آپ لوگوں کو معذرت خواہ ہوں۔ آپ کے اجلاس میں مجھے اس طرح آنے کا کوئی حق نہیں۔ فلک بلی کے جذبہ جاتی لگاؤ تھا جو مجھے یہاں کھینچ لایا۔ شاید آخری بار اسکائی لارکوں کو، ان کے ہیڈ کوارٹر اور اس کے در و دیوار کو دیکھ رہا ہوں۔“

صفدر بشیر ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ اس طرح بول رہا تھا جیسے ہانپ رہا ہو۔ ”میں اس ٹما

بلکہ اس ملک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے اپنی تمام جائیداد فروخت کر دی ہے اور
 لندن میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔“
 اس کا خوبصورت چہرہ پت جھڑ کے چٹوں کی طرح زرد پڑتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک دھندلی
 ہو چکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”مجھے فخر ہے کہ میں فلک پیا کا ایک رکن رہ چکا ہوں اور مجھے دکھ ہے کہ جدوجہد کے اس
 سفر میں میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکا۔ حالانکہ یہ میری زندگی کا آئیڈیل تھا۔ میں اب
 نیاکارواں ہوں۔ منزل سے بھٹکا ہوا، تھکا ہارا رہا ہوں۔ جس کا کوئی ہمارا ہی نہیں، جس کی کوئی
 دل نہیں۔“

یہ کہتے کہتے وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ وہ
 ہاروں کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔

کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ ہر اسکاٹی لارک اداس اداس اور کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ دفعۃً
 لہجہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لمحہ بھر تک وہ صفدر بشیر کے چہرے کو تکتا رہا۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے
 اور جذباتی انداز میں صفدر بشیر کو بھیج کر سینے سے لگا لیا۔

کچھ دیر تک دونوں اسی عالم میں کھڑے رہے۔ کمرے کی خاموشی میں دبی دبی سسکیوں کی
 آواز ابھری۔ صفدر بشیر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئی تھیں۔ سانس ابھی ہوئی تھی۔
 لہجے نے اس کی پیٹھ آہستہ آہستہ تھکتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر جذباتی ہو۔ صفدر بشیر! ابھی تم بچے ہو۔“

صفدر بشیر اس کے شانے پر جھکا ہوا آنسو بہاتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور آنسو پونچھتے
 لے کہا۔

”تب میں چلوں گا۔“

علی احمد نے پوچھا۔ ”کہاں جاؤ گے؟“

”ہوٹل اکوٹھی تو میں نے پچھلے ہفتے فروخت کر دی۔“

علی احمد نے اس دفعہ پیار سے اسے ڈانٹا۔ ”کل ہوٹل سے اپنا سامان یہاں لے آتا۔“

علی احمد نے اسے اڑنے والی مٹی، مراد چچے رہ جانے والا۔

”لیکن میں تو لندن جا رہا ہوں۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“

کئی اسکائی لارکوں کی ملی جلی آوازیں ابھریں۔

”صفدر بشیر لندن نہیں جاسکتے۔“

صفدر بشیر یہیں رہیں گے۔“

صفدر بشیر مسکرانے لگا۔ اس کا چہرہ بچوں کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا۔ اسکائی لارکوں۔

کھڑے ہو کر زور سے نعرہ لگایا۔

”صفدر بشیر زندہ باد!“

وہ اس وقت بے حد مسرور نظر آ رہے تھے۔ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اونچی آوازوں۔

بول رہے تھے۔ صفدر بشیر کی کمی انہوں نے اس کی غیر حاضری میں شدت کے ساتھ محسوس کی تھی

اور آج اسے پا کر اور اپنے درمیان دیکھ کر وہ خوشی سے کھلنڈرے نوجوانوں کی طرح اچھل رہے تھے۔

سب نے صفدر بشیر کو گھیرے میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہنس ہنس کر بے تکلفی سے بات

کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد چائے آگئی۔ علی احمد اور صفدر بشیر چائے کی پیالیاں سنبھال کر لا بیر بنا

چلے گئے۔

وہ چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔



دروازہ کھلا اور ریاض اندر داخل ہوا۔ وہ فلک پنا کارکن نہ تھا کبھی کبھار آتا تھا اور کئی گز

ہیڈ کوارٹر میں ٹھہر رہتا۔ زمانہ طالب علمی میں وہ علی احمد کا کلاس فیلورہ چکا تھا۔ اسی رشتے سے فلک

کے ساتھ اس کا رابطہ پیدا ہوا۔ وہ ہمیشہ قیام بھی علی احمد ہی کے ساتھ ہی کرتا تھا۔

صفدر بشیر بھی اسے جانتا تھا۔ مزدوروں کی یونین کے قیام میں ریاض نے بڑی مدد کی تھی

ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں وہ صفدر بشیر کے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔ صفدر بشیر کی کنارہ کشی اور ملا

کی انتخابی مہم میں بڑھتی ہوئی مصروفیات کے باعث ان دونوں یونین کی ذمہ داریاں ریاض غا

بلکہ کبھی نہیں۔

صفر بشیر نے چائے پیتے ہوئے ریاض سے دریافت کیا۔ ”یونین کی سرگرمیوں کا کیا حال ہے؟“
ریاض نے بتایا۔ ہڑتال کی ناکامی کے بعد خاصی گڑبڑ رہی۔ مگر اب صورت حال پہلے سے

”جی۔“
صفر بشیر نے مسکرا کر کہا۔ ”ریاض! تمہیں یقین ہے کہ صورت حال بہتر ہو جائے گی۔“

”کیوں؟ کیا تمہیں اس میں شبہ ہے؟“

صفر بشیر بے تکلفی سے بولا۔ ”بات یہ ہے ریاض! یہ یونین دو نین کی بات سچ پوچھو تو میرے
سے نیچے نہیں اترتی۔“

”صفر! کبھی تم نے سنجیدگی سے سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟“ ریاض نے دریافت کیا۔

”نہیں! مگر میں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ فلک پیا کے ذریعے میں بہتر طور پر کام کر سکتا ہوں۔
وہی یہ بھی چاہتا ہوں کہ فلک پیا کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں سے علیحدہ ہی رکھا جائے تو اچھا ہے۔
ت میں علی احمد سے بھی کہہ چکا ہوں۔“ صفر بشیر نے علی احمد کو براہ راست مخاطب کرتے
کہا۔

”علی احمد! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

علی احمد جواب تک خاموش بیٹھا دونوں کی باتیں سن رہا تھا، مسکرا کر بولا۔ ”فلک پیا کے
لامس اس مسئلے پر بحث بھی ہو چکی ہے۔ بلکہ کئی اسکاٹی لارک اس مسئلے پر تمہارے ہم خیال بھی
مگر مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں۔ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔“

اپناک ریاض نے صفر بشیر سے عجب ٹیڑھا سوال کیا۔ ”صفر بشیر! تم ایک لاکھ روپے سے
تک جو اکھیتے رہو گے؟“

صفر بشیر بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”میں تمہاری بات کا مطلب
اکٹھ سکا۔ کیا تم اس کی وضاحت کرو گے؟“

ریاض بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ ”میرا مطلب ہے تم اپنے سرمائے سے کب تک فلک پیا
لگاؤ گے؟ ایک دن تمہارا اثاثہ ختم ہو جائے گا۔ پھر تم اپنی جائیداد بیچ دو گے۔ وہ بھی ختم
ہو جائے گی۔ پھر کیا کرو گے؟ پھر گاڑی کس طرح چلے گی؟ کبھی تم نے اپنی جدوجہد کو اس رخ سے

بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک لاکھ یا چند لاکھ روپے سے اگر معاشرے میں تبدیلیاں آجائیں یہ بہت آسان نسخہ ہے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور ہنس کر بولا۔ ”سیدھا سادا سوال یہ ہے کہ آئندہ چاہتے کیا ہو؟“

صفدر بشیر نے مختصر سا جواب دیا۔ ”ہماری جدوجہد غربت اور پس ماندگی کے خلاف ہے۔“ مگر تم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ یہ غربت اور پس ماندگی کیوں ہے معاشرے میں یہ اونچ نیچ کیوں ہے؟ یہ امیر اور غریب میں فرق کیوں ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے اور جب تک تم اس بنیادی سوال کی تہہ تک نہیں پہنچو گے بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہو گے۔“

علی احمد نے مسکراتے ہوئے ریاض کو مخاطب کیا۔ ”کامریڈارات اب خاصی ہو چکی ہیں اور ایک ہی نشست میں اپنا انقلابی فلسفہ صفدر بشیر کو نہیں سمجھا سکتے۔“ علی احمد گفتگو ختم کرنا چاہتا تھا مگر ریاض اس کے لیے آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے فوراً وضاحت کی۔

”اس مسئلے پر صفدر بشیر سے میری پہلے بھی بات چیت ہو چکی ہے۔ یہ غربت اور پس ماند دور کرنا چاہتے ہیں اور اس جدوجہد میں محنت کشوں کی سیاسی قوت کو اہمیت بھی دینا نہیں چاہتے حالانکہ ہر جدوجہد اور ہر تحریک، خواہ سیاسی ہو، سماجی ہو یا اقتصادی، بنیادی طور پر طبقاتی ہوتی ہے یہ محنت کرنے والے اور محنت کا استحصال کرنے والے کے درمیان ایک مسلسل لڑائی ہے۔“

اس کا لہجہ تھکھا ہو گیا۔ ”جب سے انسانی معاشرے میں نجی ملکیت کے تصور نے جنم لیا اور“ کے نتیجے میں طبقات وجود میں آئے، اس وقت سے یہ لڑائی جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک طبقات ختم نہیں ہو جاتے۔ جب تک انسان کے ہاتھوں انسان کی لوٹ کھسوٹ ختم نہیں ہو جاتی۔ اس لڑائی میں آپ کو کسی ایک فریق کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا۔ درمیان کا کوئی راہ نہیں۔ درمیان کا راستہ بند گلی کی مانند ہے۔“

علی احمد نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہے۔ کم از کم فلک پیا کے بارے میں تمہیں ایسی رائے نہیں دینا چاہئے۔ اس کا کردار تعمیری ہے۔ اس کے ذریعے ہم عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان پڑھنا سکھاتے ہیں۔ طبی امداد فراہم کرتے ہیں۔ انڈسٹریل ہوم اور امدادی بینک کے ذریعے روزانہ مہیا کرتے ہیں۔ ہم عوام کے قریب جا رہے ہیں۔ ان سے دور نہیں بھاگ رہے ہیں۔ ان کے سامنے

یاد دینے پر روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے تمہاری اس رائے سے قطعی اتفاق ہے کہ ہمیں اپنی جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ محنت کشوں پر انحصار کرنا چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ ایسی صورت بن جائے کہ ہمارا سابقہ خان بہادر فرزند علی ایسے لوگوں سے ہے جو خدمت خلق کو دولت کمانے اور بھائی بھائی کی حاصل کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔“

خان بہادر کے ذکر پر صفدر بشیر نے پوچھا۔ ”میونسپلٹی کا الیکشن کیسا جا رہا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ خان بہادر کا حال بہت پتلا ہے۔“

علی احمد نے کہا۔ ”تمہارا خیال درست ہے۔ ہمارے مقابلے میں اس کی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ اس نے جلسہ عام کیا تھا وہ بد نظمی کی نذر ہو کر ناکام ہو گیا۔ ہمارے جلسے میں بھی اس نے لے لے کے غنڈوں سے گڑ بڑ پیدا کرانے کی کوشش کی تھی۔ اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔ البتہ پیسہ بٹائی کی طرح بہا رہا ہے۔“

کچھ دیر تک انتخابات ہی کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی پھر تینوں پر نیند کا غلبہ ہوا۔ فی حسب معمول علی احمد کے ساتھ ٹھہر گیا۔ صفدر بشیر واپس نہیں گیا۔ وہ بھی ایک اسکائی لک کے ساتھ ٹھہر گیا۔

(۴)

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ فلک پیا کے ہیڈ کوارٹر میں سب گہری نیند سو چکے تھے۔ لیڈنگ کوارٹر کے صدر دروازے پر زور زور سے دستک دینے کی آوازیں ابھریں فہیم اللہ نے نیند سے بیدار ہوئے دروازہ کھولا تو بھونچکا رہ گیا۔ سامنے پولیس کا مسلح دستہ موجود تھا۔ انسپکٹر نے فہیم اللہ کو پولیس، ہیڈ کوارٹر کی تلاشی لینے آئی ہے۔ پولیس والے علی احمد کے کمرے میں گھس گئے۔ اسے بائیں کونہوں نے نیند سے بیدار کیا اور پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت دونوں کو گرفتار کر لیا۔

پبلک دشمن کارروائیاں کرنے اور حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لینے کا الزام تھا۔ اس وقت تک دوسرے اسکائی لارک بھی بیدار ہو چکے تھے اور علی احمد کے کمرے میں پہنچ

نصف مل پتلا ہوتا، حالت خراب ہوتا، بھونچکا، حیران۔

چکے تھے۔ صفدر بشیر نے وارنٹ گرفتاری دیکھنا چاہا تو انسپکٹر نے یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ تھانے میں
 لمزموں کو دکھایا جائے گا۔ علی احمد نے بھی وارنٹ دکھانے پر اصرار کیا۔ مگر انسپکٹر نے اس کی ایکہ
 سنی اور اسے اور ریاض کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ صفدر بشیر اور ڈاکٹر زیدی نے ان کے
 ہمراہ چلنے کی بہت کوشش کی لیکن انسپکٹر کسی طرح رضامند نہ ہوا۔

پولیس کے جانے کے بعد اسکائی لارک دیر تک جاگتے رہے۔ علی احمد اور ریاض کی گرفتاری
 پر ان میں شدید غم و غصہ پھیل گیا تھا۔ صفدر بشیر تمام رات جاگتا رہا۔ صبح ہی صبح وہ ڈاکٹر زیدی کے
 ساتھ تھانے گیا۔ اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ علی احمد اور ریاض وہاں موجود نہ تھے۔ تھانے
 والوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ تمام دن وہ بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ حکام بالا سے ملے مگر کہیں یہ
 یہ سراغ نہ ملا کہ دونوں کو گرفتار کر کے کہاں رکھا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے شام کو صرف اس قدر
 معلوم ہوا کہ دونوں سنٹرل انٹیلی جنس کی تحویل میں ہیں۔ ان سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ کسی کو
 سے ملنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔

اسکائی لارکوں کو یہ اطلاعات ملیں تو وہ بہت مشتعل ہو گئے۔ ڈاکٹر زیدی نے سمجھا بھار کہ
 نہ کسی طور ان کے جذبات کو سرد کر دیا لیکن علی احمد کی گرفتاری کا فوری رد عمل یہ ہوا کہ اسکائی
 لارکوں نے اپنی انتخابی مہم اور تیز کردی۔ انہیں یقین تھا کہ دونوں کی گرفتاری کے پیچھے خاں بہادر
 خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ اس لیے کہ انتخابی مہم کا نگران اعلیٰ علی احمد تھا اور اس خوش اسلوبی سے
 چلا رہا تھا کہ دولت اور ہر طرح کے وسائل کے باوجود انتخابات کا پانسہ اسکائی لارکوں کے
 میں پلٹا جا رہا تھا۔ ریاض، یونین کے ذریعے مزدوروں کو اسکائی لارکوں کی حمایت میں منظم کر
 تھا۔ مزدور نہ صرف اسکائی لارکوں کے حامی تھے بلکہ ان کی انتخابی سرگرمیوں میں نہایت جوش
 خروش کے ساتھ حصہ لے رہے تھے۔ اس حلقے میں مزدوروں کی تعداد بھی خاصی بڑی تھی۔
 انتخابات کی ہارجیت کا انحصار بڑی حد تک مزدوروں کے ہی ووٹوں پر تھا۔

اسکائی لارکوں نے علی احمد اور ریاض کی گرفتاری کے بعد اپنے غم و غصے کو خاں بہادر
 خلاف انتخابی مہم میں ڈھال دیا۔ وہ اب صفدر بشیر کی قیادت میں دیوانہ وار کام کر رہے تھے۔ ان کا
 بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے انتخابات کی فضا تیزی سے اسکائی لارکوں کے حق میں بدلنا شروع

زبان اب ہر طرف اسکاٹی لارکوں کے امیدوار ڈاکٹر زیدی ہی کا چرچا تھا۔

اس صورت حال نے خان بہادر کو سخت پریشان کر دیا۔ اس نے گھبرا کر دونوں کی خریداری کا بندوبست کر دیا۔ مگر یہ ہتھ کندھ بھی کامیاب ہوتا نظر نہ آ رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ اسکاٹی لارکوں نے اپنے دوست انتخابی پروپیگنڈے سے انتخابات کو امیر اور غریب کی طبقاتی لڑائی میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کے انقلابی نعروں نے حلقے کے عوام میں ہلچل مچادی تھی۔ ان کا سیاسی شعور بیدار کر دیا تھا۔ اس کا پہلا سبب یہ تھا کہ دوڑوں کی بھاری اکثریت غریب اور پس ماندہ تھی۔ خان بہادر سے ان کی قربت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اسکاٹی لارکوں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگانے پر لوگوں نے غصے سے ناکا بہادر کے کارکنوں پر کئی بار ہلکا بول دیا۔ کارکن اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ انہوں نے گلیوں میں جانا چھوڑ دیا۔ وہ صرف بڑی بڑی سڑکوں پر منڈلاتے رہتے۔ ان کی انتخابی سرگرمیاں روک کر رہ گئی تھیں۔

خان بہادر فرزند علی کو یہ اطلاعات برابر ملتی رہتیں۔ وہ چڑچڑا اور بد مزاج ہو گیا تھا۔ بات نہ بھڑک اٹھتا، زور زور سے چیختا، کارکنوں پر برستا مسلسل سگرٹ نوشی کرتا۔ چائے کی پیالیوں والیاں خالی کرتا۔ نیند بھی اسے کم آتی۔ چہرے پر ہر وقت پریشانی اور وحشت چھائی رہتی وہ آئے نہتے منصوبے بناتا اور ان کے بارے میں اپنی انتخابی مہم چلانے والوں کے ساتھ گھنٹوں بات نہ کرتا۔



رات کے دو یا ڈھائی بجے کا عمل ہو گا کٹی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ دن بھر لو کے گرم جھکڑ چلتے رہ کر اب موسم کسی قدر خوشگوار تھا۔ شام کو ہلکی سی بوند اباندی بھی ہوئی تھی اور اس وقت بھی ٹیپ ہلچل چھائے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہیڈ کوارٹر میں اسکاٹی لارک بے خبر سو رہے۔ اچانک رات کے سنانے میں شور بلند ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ اونچی آواز میں بول رہے ہیں۔

شور بڑا بڑھتا گیا۔

منظر بشیر کا کمرہ باہر کے رخ پر تھا۔ شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ذرا دیر تک وہ ان آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہو کا عالم۔ دیرانی، مکمل خاموشی۔

کو چپ چاپ سنتا رہا۔ پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

کمرے کے دوسرے سرے پر فہیم اللہ سو رہا تھا۔ صفدر بشیر نے اسے آواز دی۔ شور سے اس کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ خوفزدہ معلوم ہو رہا تھا۔ دونوں نے کان لگا کر آواز کو سن کر کمرے کے کچھ اور نہ سن سکے۔

شور اب بہت بڑھ گیا تھا۔ آوازیں عین ہیڈ کوارٹر کے سامنے بلند ہو رہی تھیں۔ اچانک سلمان دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ کئی اور اسکائی لارک بھی تھے۔ سلمان وقت سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
”ہیڈ کوارٹر پر حملہ ہونے والا ہے۔“

حملے کی اطلاع سن کر سب گھبرا گئے۔ سلمان نے بتایا۔ ”میں باہر احاطے میں سو رہا تھا۔ شور سن کر آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر دیکھا تو ہیڈ کوارٹر سے کچھ فاصلے پر بہت سے لوگوں کا جھوم نظر آیا۔ اسکائی لارکوں کے خلاف اونچی آواز سے اشتعال انگیز باتیں کر رہے تھے میرا خیال ہے کہ ان کا تعداد پچاس سے اوپر ہی ہوگی۔“

اسی اثناء میں ڈاکٹر زیدی بھی کمرے میں آ گیا۔ اس نے بھی سلمان کی تائید کی۔ وہ کئی دن سے اٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سر کے بال خشک گھاس کی طرح کھڑے تھے۔ دروازہ کمرہ اسکائی لارکوں سے بھر گیا۔ سب سہمے ہوئے تھے۔ ان کے بشرے سے پریشانی صاف عیاں تھی۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ توڑنے کی آواز سنائی دی۔ شور تیز ہو گیا۔ اب آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ حملہ آور چیخ چیخ کر اسکائی لارکوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ پھر اس شور و غل میں ٹشور کے ٹوٹنے کی جھنکاریں ابھرنے لگیں۔ ڈاکٹر زیدی نے بے قرار ہو کر کہا۔
”ڈپنسری تباہ ہو گئی۔“

اسکائی لارک اور بھی زیادہ پریشان ہو گئے۔ شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں دھڑا دھڑا کر رہیں۔ شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ پھر ہیڈ کوارٹر کا صدر دروازہ توڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس دفعہ بالکل سامنے سے حملہ ہوا تھا۔ اسکائی لارکوں کے سامنے یہی راستے تھے۔ باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا پھر اندر رہ کر دروازے کی حفاظت کریں۔

ہوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ ان کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ ان کے ذہن مآؤف ہو چکے تھے۔ وہ سخت

جاننا تھے۔

ایک صفدر بشیر سب کے بیچ سے گزر کر دروازے کی جانب لپکا۔ قبل اس کے کہ اسکا کی
یہ غور کریں کہ وہ کیا کرنے والا ہے صفدر بشیر صدر دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے دروازہ
لہا دیا اور دروازے کے بیچوں بیچ کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے حملہ آوروں کو
بکرتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

بھائیو! پاگل مت بنو! اسکا کی لارک تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ وہ تمہارے خادم ہیں۔ وہ
اے بی لے۔“

عین اس وقت اس کی کپٹی پر ایک بڑا سا پتھر آکر لگا۔ صفدر بشیر جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کا سر
اٹکا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ خون کی ایک دھار کپٹی سے نکل کر اس کے رخسار پر پھیل گئی۔ اس
ہٹ پر توجہ دیئے بغیر اپنا ہاتھ بلند کیا۔

”بھائیو! اس دوا خانے کو برباد نہ کرو۔ یہ ہزاروں نادار مریضوں کا سہارا ہے۔ تم۔۔۔۔۔ فوراً
لاٹھی اس کے سر پر پڑی۔ وہ شرابی کی طرح جھوم کر لڑکھڑا گیا۔ اس نے دروازے کا ایک پٹ
لیا اور اس کا سہارا لے کر ہانپنے لگا۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔

”گو گوا خدا کے لیے میری بات تو سنو۔ پاگل مت بنو۔“

مگر کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ انہوں نے اس پر یلغار
لہ چاروں طرف سے لاثھیاں برسے لگیں۔ صفدر بشیر نے گھبرا کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔
وقت کی حملہ آور نے داہنی طرف سے جھپٹ کر ہٹم سے حملہ کیا۔ ہٹم کا تیز چمکتا ہوا پھل اس کے
الٹھ تھوڑا جسم کے اندر اترتا چلا گیا۔ صفدر بشیر بلبلا کر چیخا۔ ”ہائے“ اور لڑکھڑا کر گرنے لگا۔

سلمان اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور صفدر بشیر کو سنبھال لیا۔ وہ اس کے
پٹھ پر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھولنے لگا۔ سلمان نے چاہا کہ وہ صفدر بشیر کو اٹھا کر اندر لے
جائے مگر حملہ آوروں نے اتنا موقع نہ دیا انہوں نے اندھا دھند لاثھیاں برسانا شروع کر دیں۔

لب اسکا کی لارکوں کے لیے ہیڈ کوارٹر کے اندر رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ دونوں کو بچانے کے

معاذ اللہ محمد شمس نہ آنا۔ نادار۔ غریب۔ محتاج۔ بلیم۔ بھالا۔ ایک چھپار کا نام۔

لیے وہ باہر نکل آئے۔

حملہ آوروں نے ان کو زخموں میں لے لیا اور ہر طرف سے بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے۔ زخم پر زخم کھا رہے تھے اور تکلیف سے بلبلاتا کر چیخ رہے تھے۔ ان کے جسموں سے خون پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے گہری دھند پھیلتی جا رہی تھی۔

حملہ آور وحشیوں کی طرح حملے کر رہے تھے۔ وہ بلبوں، نیزوں اور لاثیوں سے اسکا لارکوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی آنکھیں شکاری چیتوں کی طرح چمک رہی تھیں اور چہرے بھوتوں کی طرح خوف ناک نظر آ رہے تھے۔ بستی بھر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ ہر گھر میں جاگ ہو گئی۔

لوگ مکانوں کی چھتوں اور دروازوں پر سہمے ہوئے کھڑے تھے اور خوف زدہ نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں اسکا لارکوں کے چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ مگر کبھی اس طرف نہ گیا۔

ہر شخص دم بخود تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ شور و غل سے دل دہلتا تھا۔



اندھیری رات میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ ہوا تیز تھی۔ دیکھتے دیکھتے شعلے بھڑک کر پھیلنے لگے۔ ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں آگ لگ گئی جس میں نادار مریشوں کا دواخانہ تھا۔ ضرورت مندوں کا امدادی بنک تھا۔ لائبریری تھی۔ یہ اسکا لارکوں کا رین بسیرا بھی تھا۔ جو معاشرے سے غربت اور پس ماندگی مٹانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ جو خان بہادر فرزند علی کے زر خرید غنڈوں کے زخموں میں گھرے ہوئے نیزوں اور لاثیوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور زخموں سے نڈھال ہو کر گر رہے تھے۔

ہیڈ کوارٹر جل رہا تھا۔ الماریاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ شیشے، موم کی طرح پگھل رہے تھے۔ کتابیں چٹاکی مانند بھڑک رہی تھیں۔ یہ امن کے پیامبر ٹالسٹائی کی لاش تھی۔ یہ فیکسنگ کا بڑا تھا۔ یہ ارسطو کا فلسفہ تھا۔ غالب اور اقبال کی شاعری تھی۔ مارکس اور لینن کا انقلابی ذہن تھا۔ آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ عظیم مصنف، عظیم مفکر۔ انسانی ارتقاء کے علمبرداروں کے

نعرہ: گجروں، دم بخود، حیران، پریشان، زمین بسیرا، رات بسر کرنے کی جگہ۔ چٹا، ٹکڑیوں کا دھیر جس پر ہندو مردے کو جلاتے ہیں۔
ارتقاء: انسان کی تدریج ترقی۔

مگر شعلہ بد اماں تھے۔ کتابیں جل رہی تھیں۔ کتابیں تباہ ہو رہی تھیں۔ علم و فضل، دانش و فن گر یہ کہاں تھے۔

ڈپنری شیشوں کا انبار بن چکی تھی۔ بوتلیں ٹوٹ چکی تھیں۔ دوائیں بکھر کر سرخ و سیاہ دھبے بن گئی تھیں۔ ڈپنری کے جلتے ہوئے درود یوار چی چی کر کہہ رہے تھے۔

”خان بہادر فرزند علی! تمہارا بول بالا ہو۔ تم امیر کبیر بنو۔ وزیر بنو۔ حاکم بنو۔ میونسپلٹی کے برٹو۔ تم نے اپنے حریف کو روند ڈالا۔ وہ دیکھو ڈاکٹر زیدی زخموں سے نڈھال پڑا سک رہا ہے۔“
ہیڈ کوارٹر کی عمارت جلتی رہی۔ شعلے اڑدھوں کی طرح سرخ سرخ زبانیں نکال کر لپکتے ہوئے بڑکتے رہے۔ آسمان کی بلندی پر دور دور تک سرخ غبار پھیل گیا دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ چرمل رہی تھی۔ ہر چیز تباہ ہو رہی تھی اسکائی لارک زخموں سے بے حال تھے۔

حملہ آور کچھ دیر تک اسکائی لارکوں کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ پھر کسی جنگی مہم سے پلٹنے لے قدم تاتاری حملہ آوروں کی طرح شور مچاتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ وہاں کئی ٹرک کھڑے تھے۔ سب ان پر سوار ہو گئے۔

انجن اشارت ہوئے اور ٹرک تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

ہیڈ کوارٹر کی جلتی ہوئی عمارت کے سامنے اسکائی لارک بے سدھ پڑے تھے۔

صفدر بشیر نہ جانے کب دم توڑ چکا تھا مسلمان اکھڑی اکھڑی سانسیں بھر رہا تھا فہیم اللہ لاپتہ تھا۔ ڈاکٹر زیدی اور کئی دوسرے اسکائی لارک خون میں ڈوبے بے حال پڑے تھے۔

پولیس اس وقت پہنچی جب حملہ آور جا چکے تھے۔ ہیڈ کوارٹر جل کر تباہ ہو چکا تھا۔

دہکتے ہوئے انگاروں کی گہری سرخ روشنی میں خاک سے لتھڑی ہوئی صفدر بشیر کی لاش پڑی تھی۔ اس کا چہرہ اپنے ہی خون میں ڈوب کر شفق رنگ ہو گیا تھا۔ نچلا ہونٹ لٹک رہا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں اور وہ بے نور نظروں سے ہیڈ کوارٹر کی جھلسی ہوئی دھواں دھواں عمارت کو تیک رہا تھا۔

لہذا تھے۔ سر مل رہے تھے۔ مگر یہ کہاں تھے۔ زور رہے تھے۔ بول بالا ہونا ترقی ہونا۔ حریف۔ مخالف۔ شفق رنگ۔ سرخ۔